www.urducouncil.nic.in
قیمت : -/10 ₹

آدمی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مارچ 2020

عالمی یوم خواتین مبارک

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

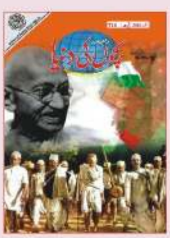

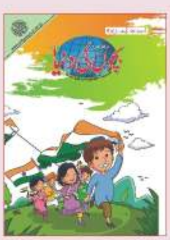

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
روبرو	رفیعہ شبنم عابدی سے مکالمہ	ڈاکٹر نشاں زیدی	5
شخصیت	نور جہاں ثروت	کہکشاں تبسم	12
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		16
جہان نسواں	ناولٹ نگار اردو خواتین	ڈاکٹر حمیرہ تسنیم	17
	رضیہ سجاد ظہیر کی تخلیقات میں نسائی شعور	ڈاکٹر آمنہ تحسین	24
	فن اور ہندوستانی خواتین	نسیم سعید	31
	حیدرآبادی ڈھولک کے گیت (تہذیبی، ادبی اور لسانی اہمیت)	ثمینہ بیگم	33
	خواتین کو بااختیار بنانے کے اہداف اور حقیقت	معصوم زہرہ	38
کہانیاں	زندگی خود ہی گناہوں کی سزا دیتی ہے!	شہانہ خاتون	43
	حسرتوں کی قبر پر	روبینہ ساگر روبی	47
حسن سخن	نازیہ پروین		51
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		52
صحت	کھانا پکانے سے متعلق ضروری باتیں	شکیل احمد	54
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		58
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		60
خواتین خبرنامہ			61

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 4 شمارہ: 3 مارچ 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی - 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 10-7-22-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

آج کے ترقی یافتہ دور میں خواتین کو صنفی امتیاز سے پاک کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن پھر بھی ہمارے معاشرے کا ایک طبقہ خواتین کو دوئم درجے کی مخلوق سمجھتا ہے۔ صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے دیگر ممالک میں بھی خواتین کی یہی صورتحال ملتی ہے۔ اس کی ذمہ دار مرداساس معاشرے کی وہ سوچ ہے جو خواتین کی کامیابیوں کا اعتراف نہیں کرتی۔ دنیا کے تمام مذاہب نے عورت کو عزت بخشی ہے لیکن مرداساس معاشرے نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔

لیکن اکیسویں صدی تک آتے آتے تصویر کافی حد تک بدل چکی تھی۔ خصوصاً مغربی خواتین میں ایک جوش اور جذبے نے جنم لیا اور ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ اس ضمن میں ورجینا وولف اور سیمون دی بوائر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں ادیباؤں کی تحریروں نے خواتین کے ذہنوں کو جھنجھوڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔ نتیجتاً مشرقی عورت نے بھی ان کی تقلید کرتے ہوئے اپنے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے بہ بانگ دہل یہ اعلان کردیا کہ وہ بھی ایک الگ وجود رکھتی ہیں۔ اب حالات کافی بدل چکے ہیں۔ آج خواتین تمام میدانوں میں مردوں کے شانہ بہ شانہ ہیں۔ ان کی ترقی کا گراف آہستہ آہستہ اونچا ہوتا جارہا ہے۔ خواتین نے اپنی محنت اور لیاقت کی بنیاد پر اپنی شناخت کو مستحکم کیا ہے۔ آج انھیں اپنی شناخت ثابت کرنے کے لیے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی عقل ودانش اور فہم وفراست سے ترقی کے منازل تیزی سے طے کرتی جارہی ہے۔ خواتین نے معاشرے کو باور کرادیا ہے کہ بھلے ہی وہ صنفی طور پر کمزور ہو لیکن دماغی طور پر کسی بھی طرح مردوں سے پیچھے نہیں ہے۔ آج خواتین لگاتار کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہیں اور یہ ان کے بلند حوصلے اور قوت ارادی کی دلیل ہے۔

خواتین کی کامیابی کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب میں بھی عورتوں کے بارے میں مثبت سوچ کا تصور ملتا ہے۔ ویدوں، اپنشدوں اور دیگر مذاہب میں عورت کے تعلق سے بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔ مختلف مذاہب میں خواتین کے تئیں نرم مزاجی اور وفاشعاری کا تصور موجود رہا ہے۔ گرونانک دیوجی نے بھی عورت کو اعلیٰ مقام پر فائز کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ عورت کوئی کمتر یا کم عقل نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کی تذلیل کی جاتی ہے۔ وہ عورتوں کے حقوق کے علمبردار تھے۔ ان کا ماننا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی مہاپرشوں نے جنم لیا ہے ان کی جننی صرف عورت ہے پھر کیوں اس کی تذلیل کی جائے یا اس کو کم عقل قرار دیا جائے۔ انھوں نے رنگ، نسل اور ذات سے اوپر اٹھ کر عورت کے بارے میں اپنی مثبت سوچ کا اظہار کیا ہے۔

دنیا کے دیگر مذاہب میں بھی خواتین کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو سکھوں کے یہاں موجود ہے۔ ہندو مذہب میں عورتوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ’’جس گھر میں عورت کی عزت ہوتی ہے وہاں دیوتا رہتے ہیں‘‘ یعنی جہاں عورت کو مکمل آزادی دی جاتی ہے، اس کے ساتھ کوئی تشدد آمیز رویہ اختیار نہیں کیا جاتا ہے اس گھر میں ہمیشہ خوشحالی آتی ہے اور وہ گھر ہمیشہ ترقی کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام میں بھی عورت کو عزت بخشی گئی ہے اور اس کو اعلیٰ مقام اور مرتبہ دیا گیا ہے۔ عورت نہ صرف گھر کی سربراہی کرتی ہے بلکہ اس کے ذریعے ہی یہ طے ہوتا ہے کہ اس کو اپنے بچوں کی نگہداشت کیسے کرنی ہے۔ ان بچوں کا مستقبل کیسے سنوارنا ہے۔ اتنا ہی نہیں وہ ان سب سے اوپر اٹھ کر بھی بہت کچھ سوچتی اور سمجھتی ہے۔ عورت وفاشعار اور نرم مزاجی کا پیکر ہوتی ہے۔ معاشرے اور قوم سے عورت کا اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔ یہ عورت ہی ہوتی ہے جو پورے عالم کو اپنے نور سے منور کرتی ہے۔ دنیا میں عورت ہی کے دم سے رونق ہے۔ اگر عورت کا وجود دنیا سے ختم ہوجائے تو عالم میں کوئی نور باقی نہیں رہے گا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین کی آزادی پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے۔ ہمیں یہ بھی کوشش کرنی چاہیے کہ انھیں اظہار کی آزادی دی جائے۔ خواتین اپنے لیے بہتر راستے کا انتخاب کرتی ہیں ہمیں ان پر مکمل اعتبار کرکے ان کو زندگی میں آگے بڑھنے کی تلقین کرنی چاہیے اور انھیں ایسی فضا ہموار کرانی چاہیے جس کے لیے وہ مدتوں سے کوشش کررہی ہیں۔ تبھی ہم خواتین کے تئیں مکمل طور پر انصاف کرپائیں گے اور ایک بہتر معاشرے کی تشکیل کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکے گا۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر نشاں زیدی

رفیعہ شبنم عابدی

سے مکالمہ

تعارف

نام: رفیعہ بیگم حسن اختر سید، **قلمی نام:** رفیعہ شبنم عابدی، **والد کا نام:** میر سجاد علی شاکر منجر، **ادبی میدان:** شاعری، تنقید نگاری، تحقیق، افسانہ نگاری، ترجمہ نگاری اور ادب اطفال، **تعلیم:** بی اے (آنرز) ایم۔ اے (اردو) ایم۔ اے (فارسی)، پی ایچ۔ ڈی، ڈی لٹ، **تدریسی تجربہ**۔ تقریباً چالیس سال، **تصنیفات:** 27 کتابیں

شاعری: موسم بھیگی آنکھوں کا (1985)، اگلی رت کے آنے تک (1994) آنگن آنگن پروائی (2010)، نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں (2011)

تحقیق: ملا وجہی اور انشائیہ (1988)، اردو شاعری میں تذکرۂ فاطمہ زہرا (1998)، کرشن چندر، ممبئی اور اردو کہانی (1999)، سردار جعفری ایک مطالعہ (2001)، مجذوب شیرازی (خواجہ حافظ۔ احوال و آثار (2002)، ہندوستان میں شیعیت اور عزاداری (2003)

تنقید: نظر نظر کے چراغ (1980)، حرف حرف چہرے (1990)، تعین (زیر طبع) اور آئینہ روبرو (تقابلی تنقید زیر طبع)

تالیف وترتیب: سردار جعفری، شخصیت اور فن کتاب نما خصوصی نمبر، بحیثیت مدیر اعزازی (1991)، نوائے سروش، عبدالستار دلوی کے ساتھ محمود سروش سے متعلق مضامین کا انتخاب (1998)، معاصر اردو ناول (معاصر ناول نگاروں پر مضامین کا انتخاب مع مقدمہ 2000) اور غالب کون ہے

ترجمہ: انوار سہیلی کی کہانیاں (فارسی سے ترجمہ 1988)، انمول کہانیاں (فارسی سے ترجمہ 1992)، میری درس گاہ (مراٹھی شاعر نارائن سروے کے شعری مجموعہ کا ترجمہ (1995)، سلام (منگیش پاڈگاؤں کے شعری مجموعے "سلام" کا مراٹھی سے ترجمہ)، فارسی ادب۔ انقلاب اسلامی کے تناظر میں (1999) اور مراٹھی ادب ایک تعارف (مراٹھی سے ترجمہ)

ادب اطفال: بچوں کے سردار جعفری (1994) اور بچوں کے یوسف ناظم

انعامات واعزازات: نوائے میر ایوارڈ، سراج اورنگ آبادی ایوارڈ، ولی دکنی ایوارڈ، جمیل مظہری ایوارڈ، ماسٹر الٰہی بخش ایوارڈ، قرۃ العین حیدر ایوارڈ، بنت ہند ایوارڈ، اکبر الہ آبادی ایوارڈ، آل انڈیا روبی ادبی ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔ نیز مختلف ادبی و سرکاری اداروں سے بحیثیت صدر، نائب صدر، سکریٹری وابستگی رہی اور صحافت سے بھی منسلک ہیں۔

سوال: آپ کا تعلق ایک ایسے شہر سے ہے جسے مایا نگری کہا جاتا ہے۔ یہاں پر دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔ ممبئی بہت سی زبانوں، بولیوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ آپ کے نزدیک اردو کو کیا فیض حاصل ہوا اور ممبئی نے اردو کی پذیرائی کس طرح کی؟

ج: بے شک ممبئی ہندوستان کا سب سے بڑا کمرشیل شہر ہے، جس کے سبب اسے مایا نگری کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ یہ بہت سی زبانوں، بولیوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے (یہ اور بات ہے کہ اس کا اپنا ایک مشترکہ کلچر اور ایک مخصوص زبان بھی ہے جس کے بارے میں لکھا

جاسکتا ہے) لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آزادی کے بعد سے، جب دہلی اور لکھنؤ جیسے اردو کے ادبی ولسانی مراکز زوال پذیر ہو رہے تھے اُس وقت ممبئی اردو کی سب سے بڑی پناہ گاہ بن کر اُبھرا۔اس زمانے کے بڑے بڑے مشہور و معروف شاعر اور ادیب خاص طور پر ترقی پسندوں نے فلم انڈسٹری سے معاشی رابطہ جوڑنے کی خواہش اور کوشش میں مختلف سمتوں سے ممبئی کا رُخ کیا۔یوں یہ شہر ترقی پسند اردو ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا۔سجاد ظہیر، سردار جعفری، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، عصمت چغتائی، بیدی، منٹو، ساحر لدھیانوی وغیرہ کے علاوہ اختر الایمان، جاں نثار اختر، میراجی، باقر مہدی، ظ۔انصاری جیسے دبنگ لکھاری، سب ممبئی ہی میں اپنی دانشورانہ کاوشوں کا مظاہرہ کرتے رہے۔پھر بہت پہلے سے یہاں مستقل طور پر کچھ ادبی خانوادے رہائش پذیر تھے جیسے سیماب اکبرآبادی، آرزو لکھنوی، پرتو لکھنوی، احسن رضوی داناپوری، محمود سروش اور مہاراشٹر کے بہت سے شعرا کے۔اس اعتبار سے ممبئی نے اردو کی زبردست پذیرائی کی اور ممبئی خود اردو ادب سے فیض یاب اور مالامال ہوگیا۔

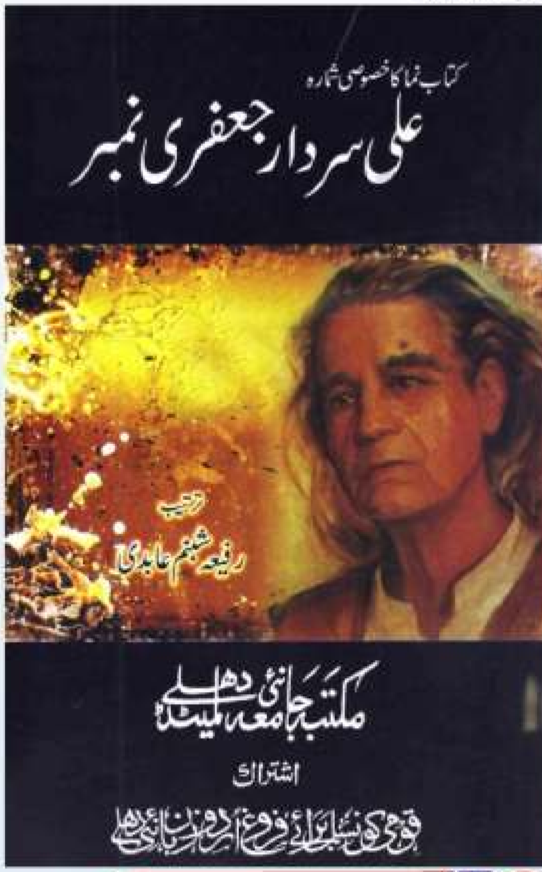

سوال : آپ نے نو سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔وہ کیا چیز ایسی تھی، جس نے آپ کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور پھر آپ اپنے جذبات شعری پیکر میں ڈھال کر کہاں تک مطمئن ہوئیں؟

ج: ایک تو یہ کہ خدائے بزرگ و برتر نے شعرگوئی کا ملکہ بچپن ہی سے فطرت میں ودیعت کر دیا تھا۔پھر والد صاحب میر سجاد علی شاکر منچری خود نہ صرف ایک ماہرِ تعلیم، ماہر ریاضیات اور ماہرِ عروضیات تھے بلکہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔گویا شاعری ورثے میں ملی۔گھر میں مختلف ادبی کتابیں اور رسالے آتے تھے جن کے مطالعے سے ذوق و شوق کو جلا ملی۔بیانیہ کے شغف نے کہانی اور افسانے کی طرف راغب کیا اور منطق ومباحث سے دلچسپی نے تحقیق و تنقید کی راہ دکھائی۔طبیعت حسّاس تھی، یوں قلم کو متحرک ہونے میں دیر نہ لگی لیکن کہاں تک مطمئن ہوئی یہ نہیں کہہ سکتی۔جو تخلیق کار اپنی تحریر سے مطمئن ہو جاتا ہے اس کی تخلیقیت کی موت ابدی ہے۔خوب سے خوب تر کی تلاش ہی تو اصل جوہرِ تخلیق ہے۔

سوال : آپ کے کلام میں آپ بیتی ہے یا جگ بیتی؟آپ کو کیا محسوس ہوتا ہے؟

ج: کسی بھی شاعر کے کلام کو اس طرح watertight compartments میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ہر شاعر کے یہاں کچھ اپنے ذاتی تجربات و جذبات اور کچھ خارجی مشاہدات و محسوسات شامل ہوتے ہیں سو میرے یہاں بھی ایسا ہی ہے۔میری شاعری میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔البتہ جب میں عورت کے کسی مسئلے پر بات کرتی ہوں تو اپنی صنف کی نمائندگی کرتے ہوئے "میں" کا صیغہ استعمال کرتی ہوں۔اب یہ قاری کے فہم پر منحصر ہے کہ وہ اسے آپ بیتی بنا کر کوئی افسانہ گھڑ دے یا نسائی مسائل کے وسیع تناظر میں اس کی تفہیم تلاش کرے۔ع: فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ کوئی بھی واقعہ چاہے ذاتی زندگی سے وابستہ ہو یا خارجی حالات و ماحول کا پیدا کردہ، اگر اس نے میرے دل پر ضرب لگائی ہو یا میرے احساس کو مہمیز کیا ہو، تو شعر ہوا ہے اور یہی میں نے اپنے تئیں ایک سکون کا باعث محسوس کیا ہے:

جو اپنے لیے ہم نے کہے تھے شبنم
چرچا ہے زمانے میں انہی شعروں کا

سوال : آپ کے شعری رویہ کو ترقی پسندی نے زیادہ متاثر کیا ہے یا جدیدیت نے؟

ج: ہر تخلیق کار کا سفر وقت کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف رواں

رواں رہتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جب آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا، شہر کے ادبی افق پر ترقی پسندوں کو جلوہ فشاں پایا۔ آنکھوں نے انہیں کو دیکھا ،کانوں میں انھیں کی آوازیں گونجی کبھی سردار جعفری، کبھی کیفی، کبھی مجروح اور کبھی ساحر لدھیانوی کی۔ ظاہر ہے ذہن پر ان کا غلبہ ہونا لازمی تھا۔ لہٰذا میری ابتدائی شاعری ترقی پسندوں سے بے حد متاثر رہی خاص طور پر فیض، سردار جعفری بلکہ سب سے زیادہ ساحر سے، گویا رومان اور انقلاب کا امتزاج بیش تر نظموں کی صورت میں ہے۔ پھر جیسے جیسے مطالعے میں وسعت پیدا ہوتی گئی، ذہن پر جدیدیت کے اثرات مرتب ہوتے گئے۔ میری غزلوں اور نظموں کا رنگ بدلنے لگا اور آہستہ آہستہ جدیدیت ذہن پر غالب آگئی اور اب مابعد جدیدیت نے ذہن کو ایک نیا راستہ دکھایا ہے۔

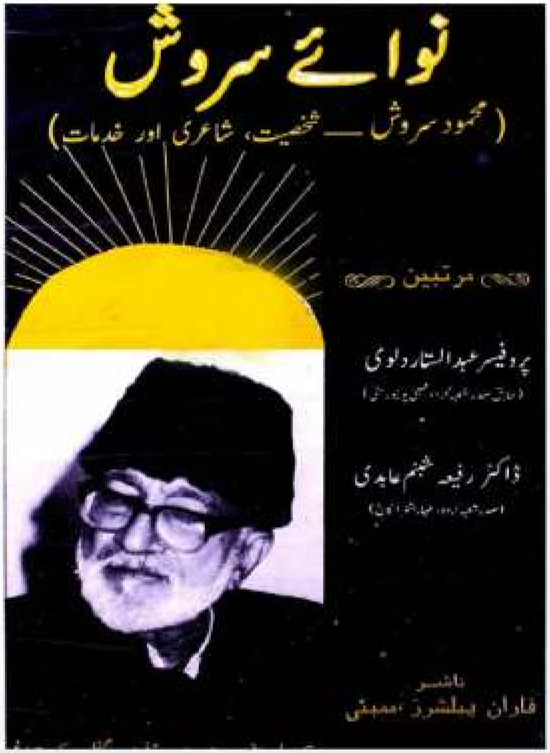

سوال : شاعرات کے ساتھ سماجی رویہ کیسا رہتا ہے؟

ج: اب ویسا تو نہیں رہا جیسے آج سے چالیس پچاس سال پہلے ہوتا تھا۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارا سماج کہانی کار خواتین کو تو قبول کرتا رہا ہے کہ فکشن کا ادب گھروں میں رہ کر تخلیق ہوتا اور پڑھا جاتا ہے۔ عام طور پر ہماری خواتین گھر کی چار دیواری میں رہ کر ہی کہانیاں لکھتی اور شائع کرواتی ہیں۔ جنہیں قاری رسالوں اور کتابوں کے توسط سے پڑھ لیتے ہیں اور ان کے فن کی داد دے لیتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ خواتین افسانہ خوانی کی نشستوں میں بھی شرکت کرتی ہیں جس پر سماج کو اعتراض نہیں مگر شاعرات اپنا کلام صرف چھپواتی نہیں بلکہ محفلوں میں سناتی بھی ہیں، پڑھتی بھی ہیں کبھی تحت میں، کبھی ترنم سے۔ سماج اس بات کو برداشت نہیں کرپاتا ہے کہ عورت یوں سرِ بزم اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ اس لیے شاعرات کی پذیرائی کم ہی ہوتی ہے پھر آج کے مشاعروں میں متشاعرات کی شرکت نے اچھی خاصی شعری محفلوں کو کاروباری اور بازاری بنادیا ہے اور آبروئے شیوۂ اہلِ نظر جاتی رہی ہے۔ بہر حال اب صورتِ حال کچھ کچھ بدل رہی ہے اور نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں۔

سوال : آپ کو اردو، ہندی، فارسی، انگریزی اور مراٹھی زبانوں کے ادب پر قدرت حاصل ہے۔ آپ نے مراٹھی اور فارسی سے ترجمہ بھی کیا ہے۔ آپ ترجمہ نگاری کی روایت اور اردو ترجمے کے تعلق سے کیا کہنا چاہیں گی اور آپ کو اپنے کن تراجم پر فخر ہے؟

ج: افوہ! ان سب زبانوں پر؟ اور قدرت؟ نہیں بھئی، بس تھوڑی بہت شد بد ہے۔ اتنے بڑے بڑے دعوے میں نہیں کرسکتی۔ ویسے بھی ترجمہ، جسے ادب میں دوسرے درجے کی چیز خیال کیا جاتا ہے، ایک حوصلہ آزما فن ہے۔ اول تو بیک وقت دو زبانوں پر یکساں قدرت رکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ دوم یہ کہ کسی ایک زبان کی تخلیق کو اس کی تمام تر لسانی، تہذیبی، سماجی اور فکری روایتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دوسری زبان میں یوں منتقل کرنا کہ اس کی بنیادی شناخت بھی باقی رہے اور ترجمہ ہونے والی زبان کے ادب میں بھی پیوند کاری نہ محسوس ہو، کارے دارد۔ گویا ترجمہ نگار کو اس ماہر خیاط کا رول ادا کرنا ہے جس نے کسی شخص کے جسم کے اعتبار سے ایک perfect جامہ ایسا تیار کیا ہو جو مذکورہ شخص پر چست لگے مگر جب کوئی دوسرے شخص کو پہنایا جائے تو یہی جامہ اس کا اپنا نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے بدن کو بھی زیبائی عطا کرے اور وہ بخوشی اپنے دوسرے لباسوں کے ساتھ اسے بھی اپنے وارڈروب کی زینت بنالے۔ نثر میں تو خیر اتنی دشواری نہیں لیکن شاعری کا ترجمہ خاص طور پر زیادہ مشکل ہے کیوں کہ اس میں استعاروں، علامتوں، محاوروں اور دیگر صنعتوں اور لفظوں سے پرے ''ماورائے سخن'' شاعر جو بات کہتا ہے اس کو دوسری زبان میں من وعن منتقل نہیں کیا جاسکتا منظوم ترجمہ تو سب سے مشکل ترین منزل ہے۔ یہی مسئلہ اردو کے ساتھ بھی درپیش ہے۔ وہ زبانیں جو ایک ہی خاندان کی ہوں یا تہذیبی اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہوں تو ان کا ترجمہ کسی حد تک ممکن ہوجاتا ہے۔ مثلاً فارسی اور اردو، ہندی اور اردو وغیرہ مگر وہ زبانیں جو بالکل الگ لسانی و تہذیبی سرمایہ رکھتی ہیں ان کا اردو میں ترجمہ مشکل ہے

جیسے فرانسیسی اور اردو، چینی اور اردو، جاپانی اور اردو وغیرہ۔ ایک اور بات، ترجمے سے ترجمہ کرنا یعنیٔ کسی فلٹر ترجمے کی صحت پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ بہتر یہ ہے کہ براہِ راست کسی زبان سے ترجمہ کیا جائے کیوں کہ ترجمہ کی جانے والی زبان کے ماہرین بھی کبھی کبھی اپنی ہی زبان کے فن پاروں کی تفہیم میں غلطی کرتے ہیں اور ترجمہ گم راہی کا شکار ہوجاتا ہے۔ ترجمہ نگاری کے دوران یہ بات میں نے خود محسوس کی کہ ہمارے مراٹھی کے اسکالروں سے ہندی ترجمے میں اور فارسی اسکالروں سے اردو ترجمے میں ایسی چھوٹی چھوٹی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ترجمے کے تعلق سے میں نے یہ بات بار بار کہی ہے اور آج بھی دُہرانے دیجیے کہ جس زبان کی تخلیق کا ترجمہ ہوتا ہے ظاہر ہے اُس زبان کو چاہے وہ انگریزی، فارسی، عربی، مراٹھی، تیلگو، بنگالی، اُڑیہ کچھ بھی ہو، اردو کا ہر قاری تو جانتا نہیں۔ لہٰذا وہ تو اس اردو ترجمے کے سہارے ہی مذکورہ زبان کا ادب پارہ پڑھے گا نا؟ اب مترجم کس حد تک ترجمہ (چاہے وہ فلٹر ہو یا براہِ راست) کس تک حد صحیح ترجمہ کر رہا ہے اس کا اندازہ تو عام قاری کو ہو ہی نہیں سکتا سوائے معدودے چند کے، جو تخلیق یا فن پارے کی زبان سے بھی واقف ہوں۔ پس ترجمے پر کیا گیا تبصرہ بھی کتنا ایمان دارانہ اور کتنا غیر منصفانہ ہے اس کا اندازہ بھی عام قاری نہیں لگا سکتا۔ پس اپنے کسی ترجمے پر فخر کرنا عجیب سا لگتا ہے۔ اپنی تخلیق پر بھی فخر نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں خوب سے خوب تر کی گنجائش باقی رہتی ہے تو ترجمے پر کیسا فخر؟ ہاں کچھ ترجمے اپنے کیے ہوئے بہتر محسوس ہوتے ہیں جیسے خواجہ حافظ شیرازی کی ایک سو چودہ غزلوں کے منظوم ترجمے، منگیش پاڈگاؤنکر کے مجموعے ''سلام'' کی نظموں کے مراٹھی سے اردو ترجمے وغیرہ۔ ہاں ایک آخری بات کہ ترجمے اور تخلیق میں تھوڑا فاصلہ ضروری ہے تاکہ اصل تصویر اور عکس میں امتیازی شناخت باقی رہے۔

سوال: آج کے دور میں مشاعروں سے شاعرات بہت شہرت حاصل کررہی ہیں، آپ کے نزدیک مشاعروں کی شاعرات میں اور جو مشاعروں میں نہیں جاتی ہیں اُن شاعرات میں کیا فرق ہے یا مشاعروں سے اردو کو کیا فیض حاصل ہو رہا ہے؟

ج: چند منفی نتائج سے قطع نظر مشاعرے ہماری تہذیب، ہماری زبان اور ہمارے ادب کی تشہیر کا ایک بہترین وسیلہ ہیں۔ اس سے ہمارے سامعین کے ذہنی افق کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ سامعین کا علمی و ادبی ذوق پروان چڑھتا ہے نیز ادب کی رفتار اور ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ عصری ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات سامنے آتے ہیں۔ مشاعروں نے اردو کی مقبولیت میں اتنا اضافہ کردیا ہے کہ آج ہر غیر اردو داں اس زبان کو سیکھنے کے لیے بے چین ہے۔ اب بھی کیا آپ یہی کہیں گی کہ مشاعروں سے اردو کو کیا فیض حاصل ہو رہا ہے۔ ہاں البتہ آپ کے سوال کا پہلا حصہ غور طلب ہے۔ 'آج مشاعروں سے شاعرات بہت شہرت حاصل کررہی ہیں' کہہ کر genuine شاعرات کی توہین مت کیجیے۔ اگر خود شعر کہنے والی شاعرات مشاعروں سے شہرت حاصل کررہی ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ فی زمانہ کمرشیل مشاعروں کے انعقاد اور متشاعرات کی شرکت نے اس ادارے کو بازاری اور صارفانہ بنادیا ہے۔ آواز کے دم پر لکھ کر دیا ہوا مستعار کلام جس میں شعر کہہ کے دینے والے شاعروں کی سیاست۔ تجارت، شرارت اور بہت حد تک ''شرافت'' کو دخل حاصل ہوتا ہے ہندی رسم الخط میں اردو کے نام سے پڑھنا، خواتین کے تہذیبی معیار سے پست، گھٹیا، کسی حد تک فحش اشعار کی نغمہ سرائی، ناظرین و سامعین کی ہوس ناک نظریں اور مضحکہ اڑانے والی آوازیں، بار باران گلے باز متشاعرات کی جانب سے تالیوں اور داد وصول کرنے کا فقیرانہ مطالبہ۔ یہ اور ایسی بہت سی باتیں جنھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ مشاعرہ نہیں بلکہ کوئی اور ہی 'محفل' ہے، بے حد ندامت و تاسف کا مقام ہے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف مشاعروں کا معیار گر گیا ہے بلکہ اچھی بھلی شاعرات کا اعتبار بھی جاتا رہا ہے۔ اسی لیے معتبر شاعرات ایسے مشاعروں میں شرکت کرتے ہوئے گریز کرتی ہیں۔ بقول:

جب سے دیکھا ہے کہ نا اہل بھی ہیں جام بکف
مجھ کو پیمانہ اٹھانے سے حیا آتی ہے

اس ضمن میں نہرو سنٹر ممبئی کے منتظمین کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے جنھوں نے ایسے متشاعر و متشاعرات کے لیے No Entry کا بورڈ لگا رکھا ہے۔

سوال: آپ نے افسانے بھی لکھے، شاعری بھی کی اور تنقیدی کتابیں بھی آپ کی منظرِ عام پر آئیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے آپ کو سب سے زیادہ پذیرائی کس سے حاصل ہوئی؟

ج: پذیرائی حاصل ہو نہ ہو، مجھے روحانی سکون سب کے لکھنے میں ملا۔ جہاں تک افسانہ نگاری کا تعلق ہے، آپ کو بتادوں کہ میں نے اپنا پہلا افسانہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں لکھا جب میں نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ ''بیسویں صدی'' اور ''شمع'' اس وقت کے مقبول ترین رسالے تھے جن میں اپنے دور کے تمام قد آور فکشن رائٹرز جیسے کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر اور واجدہ تبسم اور رام لعل وغیرہ کی شمولیت واشاعت رسالے کے معیار کی

ضامن تھی۔ جب میں انٹر میں پڑھ رہی تھی اس وقت میرا افسانہ پہلی بار 'بیسویں صدی' میں شائع ہوا یہی وہ دور ہے جب پروفیسر حامدی کاشمیری، کیول دھیر اور نور شاہ وغیرہ شائع ہورہے تھے۔ادب پسند حضرات کے درمیان اردو کے اس رسالے کی زبردست مانگ تھی۔ایسے افسانہ نگاروں کے ساتھ جب میرا افسانہ شائع ہوا تو ایسا لگا کہ ساری دنیا کی خدائی مل گئی ہو۔اس وقت میں رفیعہ شبنم منچری کے نام سے لکھا کرتی تھی اور 'بیسویں صدی' کے ساتھ ساتھ ناچیز کو بھی دنیا بھر کے اردو قارئین میں کم سنی ہی میں مقبولیت حاصل ہوگئی شاید پذیرائی کی یہ پہلی منزل تھی۔شادی کے بعد میں رفیعہ شبنم عابدی بن گئی اور ازدواجی زندگی کی مصروفیتوں نے میرا سارا وقت چھین لیا۔وہ افسانہ نگار کہیں کھوگئی جس کے افسانے ہی نہیں افسانوں کے ساتھ شائع ہونے والے خطوط کے جملے بھی قارئین کو ازبر ہوجاتے تھے۔'صاحب کتاب' ہونے کی اہمیت کا علم نہ تھا یوں پبلشرز کی فرمائشوں کے باوجود ان افسانوں کو کتابی شکل نہیں دے پائی اور خواتین افسانہ نگاروں کی تاریخ میں اپنا نام 'رجسٹرڈ' نہ کرواسکی۔ پھر 1970 کے بعد دوبارہ لکھنا چاہا تو اردو افسانہ بہت آگے بڑھ چکا تھا اور میرا افسانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا لہٰذا اس شوق کو موقوف کردینا پڑا کہ بچوں کی پرورش مانع ہوگئی۔ البتہ شاعری چلتے پھرتے ہوتی گئی یہاں تک کہ چار شعری مجموعے منظر عام پر آئے جن پر ملک کی مختلف اکاڈمیوں سے انعامات بھی ملے۔ان پر متعدد مضامین کا سلسلہ اب تک جاری ہے نیز مشاہیر ادب نے بھی اپنی گراں قدر آراء سے نوازا۔مختلف یونیورسٹیوں میں میری شاعری پر ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے لکھے جارہے ہیں۔اس پذیرائی کے لیے میں اپنے قارئین وناقدین کی ممنون ہوں۔رہی تنقید تو خواتین تنقید نگاروں پر بہت کام ہونا ہے۔جس دن ہمارے لکھاری اس طرف توجہ فرمائیں گے تو شاید تنقید کی اس فہرست میں کسی کونے میں ناچیز کا نام بھی مل جائے۔ابھی تو انھیں صرف ممتاز شیریں ہی سے الجھے رہنے دیجیے۔

سوال : تانیثیت کے بارے میں آپ کا کیا کہنا ہے۔اس کو آپ کہاں تک صحیح مانتی ہیں؟

ج: مرد اساس معاشرے کے ظلم وستم کی بلند بانگ دہائی اور اپنی بے بسی اور مظلومی کی مبالغہ آمیز تشہیر کی بنیاد پر صنفی مساوات کا زوردار مطالبہ اور بے لگام آزادی کا مظاہرہ،عورت کے حیاتیاتی وفطری تقاضوں اور نسوانی فرائض (مثلاً خانہ داری، بچوں کی پیدائش اور پرورش و پرداخت وغیرہ) سے انکار،مردوں کے نام جی بھر کے دشنام طرازی اور ادب کی صورت میں مجذوب کی بڑ یا شرابی کی بہکی ہوئی ذہنی رو کی سے نظمیں تخلیق کرنا اور ہم مشربوں سے دانش وری کی داد بٹورنا۔اگر یہی تانیثیت ہے تو مجھے یہ تانیثیت منظور نہیں۔میں تو اردو میں بھی رشیدۃ النساء یا ڈاکٹر رشید جہاں کو پہلی تانیثی ادیبہ ماننے کو تیار نہیں کیوں کہ ان دونوں کے ہاں عورتوں کی حمایت تو ملتی ہے مگر وہ باغی اور بے باک آواز نہیں ملتی جس کی درد بھری اونچی لے عصمت آپا کے ہاں موجود ہے۔ہماری عصمت آپا جن کے افسانے 'لحاف' میں پہلی بار وہ تانیثی آواز سنائی دیتی ہے جو مردوں کی عیاشی کے نتیجے میں خانہ نشین عورت کے فطری تقاضوں کی ناتکمیلیت اور ازدواجی حق تلفی کے سبب ہونے والی جنسی گم راہی کے ذمہ دار جاگیردارانہ نظام کے خلاف ایک زبردست احتجاج کی صورت میں اٹھی ہے اتنے نازک مسئلے کو ایک خاتون ادیبہ نے اس وقت موضوع بنایا جب اردو ادب اس آواز سے ناآشنا تھا۔یہ وہی تانیثیت ہے جس کی میں تائید کرنا چاہتی ہوں۔میں نے بار بار کہا ہے اور آپ کے سوال کے جواب میں بھی یہی کہوں گی کہ "میرے نزدیک تانیثیت وہ تحریک یا نظریہ نہیں جو مغرب کی خواتین کی دین ہے بلکہ مرد کی رفاقت میں عورت کے جائز آزادانہ حقوق کی بحالی اور عمل برآوری کے مخلصانہ اعلان کا نام ہے۔ایک ایسا اعلان جو عورت کی باغیانہ نعرہ بازی سے نہیں بلکہ مرد کی جانب سے منصفانہ پُرخلوص مفاہمتی رویے کے ساتھ ہو۔"

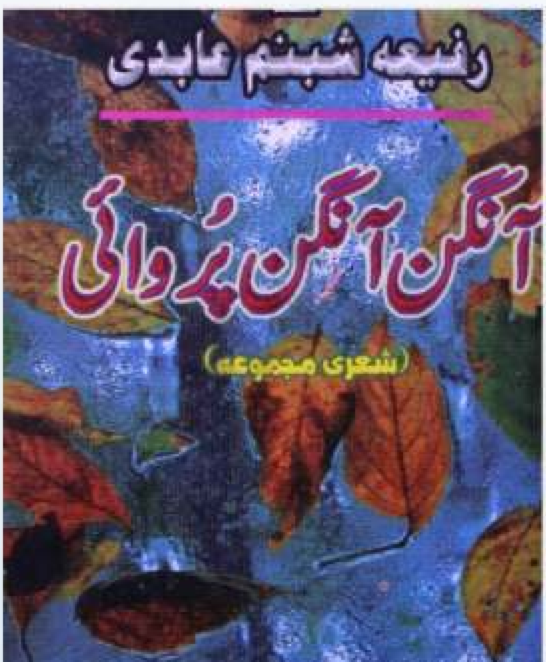

سوال : آپ کی کتاب 'معاصر اردو ناول' اردو ناول نگاری پر اہم کتاب ہے۔ آپ اس میں کرشن چندر سے بہت متاثر نظر آرہی ہیں یہاں تک کہ آپ نے انتساب کرشن چندر کے نام کیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: کرشن چندر زمانہ طالب علمی سے ہی میرے پسندیدہ فکشن نگار (معاف کیجیے، یہ ترکیب ایسی ہی ہے جیسے ناول نگار اور ڈراما نگار) رہے ہیں۔ نہ صرف ان کے ناول بلکہ افسانوں نے بھی میرے ذہن کو جھنجوڑا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کہانی لکھنے کی ترغیب ان کی کہانیوں ہی سے پائی۔ جب میں ہائی اسکول میں تھی شاید آٹھویں جماعت میں اردو کی نصابی کتاب میں ان کی ایک کہانی ''نیا خزانہ'' کے عنوان سے پڑھی تھی جو بعد میں تلاشِ بسیار پر بھی مجھے نہیں مل سکی۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک بچہ ہے پانچ چھ سال کا جو اسکول کی کتابوں اور گھر والوں کی پابندیوں سے بے زار اپنے ذاتی خزانے میں گم ہونا چاہتا ہے۔ وہ خزانہ کیا ہے؟۔ باپ کے پھینکے ہوئے پرانے بے کار قلم یا نبیں، ماں کی ٹوٹی چوڑیاں، کچھ الٹے سیدھے کھلونے اور اِدھر اُدھر کا کباڑ۔ اُسے ایک نئے خزانے کی تلاش ہے۔ اس کا باپ جو ایک کہانی کار ہے اپنے بچے کی نفسیات کو جانتا ہے اور ایک دن جب وہ ماں کی تنبیہ کے باوجود اسکول جانے سے جی چراتا ہے تو باپ اسے چپکے سے اپنے ساتھ اسکول کی دنیا سے دور فطرت کے نظاروں کی سیر کراتا ہے یہاں تک کہ بچہ حصولِ انبساط اور روحانی مسرّت کی فیض یابی کی منزل پر پہنچ کر، تھک کے باپ کے کندھوں پر سو جاتا ہے گویا جس خزانے کی اسے تلاش تھی وہ نیا خزانہ اسے مل گیا ہو۔ کہانی کے اختتام پر کرشن چندر کہتے ہیں ''بچہ بہت کچھ کرنا چاہتا ہے۔ وہ بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن وہ بہت کچھ کر نہیں سکتا کیوں کہ یہ دنیا بچوں کی نہیں بڑوں کی دنیا ہے'' اس کہانی کے سنانے کا مقصد یہ تھا کہ اُسی دن سے کرشن چندر میرے پسندیدہ کہانی کار بن گئے۔ میں نے ان کی کہانیاں پڑھنا شروع کیں اور ہر بار ایک نیا خزانہ میرے ہاتھ لگا۔ اس کہانی کا اثر ایسا گہرا ہوا کہ آج تک ذہن سے کرشن چندر کا نام مٹتا ہے نہ ان کے فن کی بوقلمونی۔ بے شک کرشن چندر ہمارے ادب کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں کرشن چندر کی کہانیوں کے ترجمے ہوئے شاید ہی کسی اور کے ہوئے ہوں۔ وہ محبت، فطرت، انقلاب اور انسان دوستی کا فن کار ہے اس لیے آج کی نفرت بھری دنیا میں اب بھی اس کی ضرورت باقی ہے لیکن جانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ برِصغیر کی عصری تنقید میں کرشن چندر کو بہت حد تک نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ مانا کہ منٹو ہمارے عہد کا ایک بہت بڑا حقیقت نگار اور برِصغیر کے اردو ادب کا مشترکہ سرمایہ ہے پھر بھی غور کیجیے کہ پاکستان میں کرشن چندر پر اتنا نہیں لکھا جا رہا ہے جتنا ہندوستان میں منٹو پر۔ ایسا کیوں؟

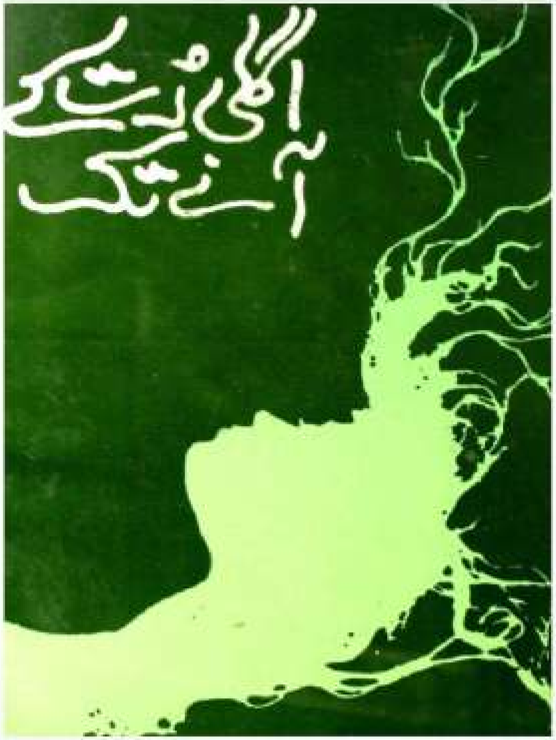

سوال : اس کتاب کے مقدمے میں آپ نے لکھا ہے کہ 1970 کے بعد کے ناولوں پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ موضوعات کا تنوع ملتا ہے بلکہ تکنیک کی جدّت بھی نظر آتی ہے آپ کے نزدیک 1970 سے اب تک ناول کے موضوعات میں کیا فرق آیا ہے؟

ج: سب سے پہلے تو یہ بتاؤں کہ مبہم علامتی اور مجرد کہانیوں کا چلن کم ہو گیا۔ ایک بار پھر ناول ماجرائی ہونے لگے۔ قصہ یا کہانی لوٹ آئی۔

موضوعات کے اعتبار سے کہانی کی پیش کش کے انداز بدلے۔ کہیں کہانی خود نوشت بن گئی (گیان سنگھ شاطر اور ندا فاضلی کے ناول)، کہیں غیر مبہم علامتیں کہانی کے پلاٹ کا کام کرتی نظر آتی ہیں (غضنفر کا 'پانی'، شموئیل احمد کا 'ندی'، سید محمد اشرف کا 'نمبردار کا نیلا' وغیرہ)، کہیں زبان میں نئی تبدیلیوں کے تجربے (دویہ بانی: غضنفر، اندھیرا پگ: ثروت خان، کہانی سناؤ متاشا اور جس دن سے: صادقہ نواب سحر) کہیں کہانی میں کہانیاں یعنی داستان گوئی کی تکنیک: غضنفر کا 'کہانی انکل' مظہر الزماں کا 'آخری داستان گو'، عشرت ظفر کا 'آخری درویش') پھر مشرف عالم ذوقی

کے نفسیات، فلسفہ اور سیاست پر مبنی تجزیاتی ناول وغیرہ۔ یہ اور اس قسم کے کئی اور تکنیکی تجربے جو پیغام آفاقی، ترنم ریاض، سلیم شہزاد، یعقوب یاور کے علاوہ حال قریب میں انیس اشفاق، نورالحسنین، سلیم خان وغیرہ کے ہاں دکھائی دیتے ہیں۔

سوال: میم! آپ مختلف اصناف میں لکھ رہی ہیں، معیاری لکھنے کے لیے آپ کے نزدیک کیا ضروری ہے؟ خداداد صلاحیت یا ذمہ داری؟

ج: دیکھیے نشاں! ادب کا کوئی مطلق معیار نہیں ہوتا کہ ہم اس مخصوص معیار کے پیشِ نظر کچھ لکھنا شروع کریں۔ تخلیق خود اپنا معیار بناتی ہے اور اس کا تعین کرنا ادیب کا نہیں نقاد کا کام ہے۔ ادیب تو اپنے تئیں ایک ادب پارہ تخلیق کر کے قارئین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب وہ ادب پارہ یا تخلیق معیاری ہے یا غیر معیاری، یا معیاری ہے تو کس حد تک؟ کتنی؟ اس کی قدر و قیمت یا تو قاری آنکتے ہیں یا نقاد۔ بہتر تنقید وہی ہوتی ہے جو قاری اساس ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ایک معیاری ادب پارے کی تخلیق میں خداداد صلاحیت کو زبردست دخل حاصل ہے ورنہ ہر شاعر غالب اور میر بن جاتا۔ اس خداداد صلاحیت کے باوجود اس تخلیق کے معیار کو پرکھنے کے لیے کسی عبدالرحمٰن بجنوری یا خواجہ احمد فاروقی کی ضرورت ناگزیر ہے۔ البتہ یہ لازمی ہے کہ جب کوئی ادیب کچھ لکھے تو پوری ذمہ داری کے ساتھ کہ اس کی تخلیق تمام تر ادبی، فنی، تہذیبی و اخلاقی تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر لکھی گئی ہو۔ پس خداداد صلاحیت کے ساتھ ساتھ ضروری ہے مطالعہ اور وہ بھی مسلسل، نا مختتم مطالعہ تا کہ ذہنی وسعتوں میں اضافہ ہو جو تخلیقی صلاحیت کو مہمیز ہی نہیں کرتا، عمدہ سے عمدہ معیاری ادب تحریر کرنے کی ترغیب بھی دلاتا ہے۔

ادیب کی ذمہ داری ہے کہ اپنے عصر کے سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی ہر قسم کے حالات، واقعات اور سانحات سے کماحقہٗ واقف اور باخبر ہو۔ عصری حسیت کے بغیر کسی ادبی تخلیق کا وجود ایسا خوش رنگ مشروب یا پکوان بن جاتا ہے جس میں شکر یا نمک نہ ہو۔

سوال: آپ نے بچوں کے لیے بھی کتابیں لکھیں جیسے بچوں کے یوسف ناظم، بچوں کے سردار جعفری اس کا کیسا رسپونس رہا؟

ج: میرے ادبی کیریئر کی ابتدا نو دس سال کی عمر سے ہوئی۔ گویا میں نے بچپن ہی سے بچوں کی کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کر دی تھیں، جو اس وقت کے بچوں کے رسالوں اور روزناموں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی تھیں۔ شادی کے بعد یہ خزانہ اپنے گھر منتقل نہیں کر پائی۔ بار بار رہائشی تبدیلیوں کے سبب میری بہت سی ابتدائی تحریریں ضائع ہو گئیں جن کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ بعد میں بچوں کے لیے جتنی کتابیں منظرِ عام پر آئیں ان میں سے بیش تر سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کی دعوت یا فرمائش پر لکھیں۔ جیسے قومی کونسل برائے فروغ اردو کے لیے 'انوار سہیلی کی کہانیاں'، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی کی فرمائش پر 'انمول کہانیاں' 'بچوں کے سردار جعفری' 'بچوں کے یوسف ناظم' اور ہندوستانی پرچار سبھا ممبئی کی دعوت پر 'صبر کا پھل' وغیرہ ظاہر ہے ان پر متعدد تبصرے آئے۔ کتابیں پڑھی گئیں، پسند کی گئیں۔ ظاہر ہے خریدی بھی اتنی ہی گئی ہوں گی۔ اس کا حساب تو مذکورہ ادارے ہی دے سکیں گے۔

سوال: بچوں کی تربیت کے لیے کیا ضروری ہے؟ سبق آموز کہانیاں یا تفریحی کہانیاں؟

ج: بچے معصوم ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے تفریح اور حظ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لیے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ہنسی ہنسی میں کوئی کام کی بات بتا دی جائے۔ یعنی تفریحی کہانیوں کو ہی سبق آموز بنا دیا جائے۔ ان کے خام اور نرم ذہنوں پر جو نقش ثبت ہوتے ہیں وہ زندگی بھر نہیں مٹتے۔

سوال: نئے لکھنے والوں کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے؟

ج: یقین محکم، جدوجہدِ مسلسل، بے حساب مطالعہ، تجربات و مشاہدات کی باریک بینی اور زبان کے استعمال کا گہرا شعور۔ اچھا ادب تخلیق کرنے کے لیے یہ تمام عناصر ضروری ہیں۔

□□□

Dr. Nisha Zaidi

B-63/S-2 DLF Colony

Dilshad Ext. - II, Sahebabad,

Dist. Ghaziabad -201005 (U.P)

کہکشاں تبسم

نور جہاں ثروت

عہد حاضر میں عورتیں عملی زندگی سے زیادہ جڑی ہوئی ہیں۔ ان کی تخلیقی کاوشوں میں زندگی کے خارجی اور باطنی دونوں پہلوؤں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ایک عورت کے لیے غزلوں میں باہری دنیا کے تجربوں کے ساتھ ساتھ اپنے جذبوں کو بھی زبان دینے کا عمل کتنا مشکل ہوگا اسے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ غزل تو ریشم کاتنے کا فن ہے کہ دھاگے میں نزاکت اور ملائمیت ماہر انگلیاں ہی بھر سکتی ہیں۔ نور جہاں ثروت شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صحافی بھی تھیں۔ عملی زندگی کا قوی مشاہدہ اور اس کے نشیب و فراز کے تجربے میں ان کی شرکت تھی۔ ان کا ایک شعری مجموعہ 'بے نام شجر' 1995 میں منظر عام پر آیا۔ چونکہ شاعرہ کم گو تھیں اس لیے ان کے مجموعہ کو مختصر کہا جا سکتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ 17 اپریل 2010 کو لگ بھگ ساٹھ برس کی عمر میں دہلی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ نور جہاں ثروت کی شاعری ایک باشعور اور بالغ نظر نسائی شخصیت کا فکری اظہار ہے۔

عہدِ موجودہ میں زندگی بے یقینی، بے اعتباری، خوف، بے بسی، مکر و فریب، تہذیبی قدروں کے زوال اور رشتوں کے انحطاط سے عبارت ہے۔ انہی عناصر سے نور جہاں ثروت کی غزلوں کا منظر نامہ تیار ہوا ہے۔ کمال یہ ہے کہ مسائل سے نبرد آزما ہونے کے باوجود انفعالی جذبوں کو شاعرہ خود پر حاوی نہیں ہونے دیتیں بلکہ جبر و استحصال کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کرتی ہیں۔ سفاک حقیقتوں کو جمالیاتی احساس اور تخلیقی فکر سے ہم آہنگ کر کے وہ اشعار کی صورت گری کرتی ہیں:

اب نہ رشتوں میں حرارت نہ صداقت کوئی
زندگی کیسے کہ ہے خود سے بغاوت کوئی

گلیوں میں اس کی کچھ نہ ملا کرب کے سوا
اب آرزو کا شہر بدلنا پڑا مجھے

ساتھ میرے اپنے سائے کے سوا کوئی نہ تھا
اجنبی تھے سب جہاں میں آشنا کوئی نہ تھا
سارے رشتے ریت کی دیوار تھے موسم کے پھول
بات کا سچا یہاں دل کا کھرا کوئی نہ تھا

کدورتیں تھیں غضب کی کہ منھ چھپانا پڑا
وہ شہر دوست تھا لیکن پلٹ کے آنا پڑا

جس دشتِ بے شجر میں جنوں مجھ کو لے گیا
امید کے بھی سائے سے ڈرنا پڑا مجھے

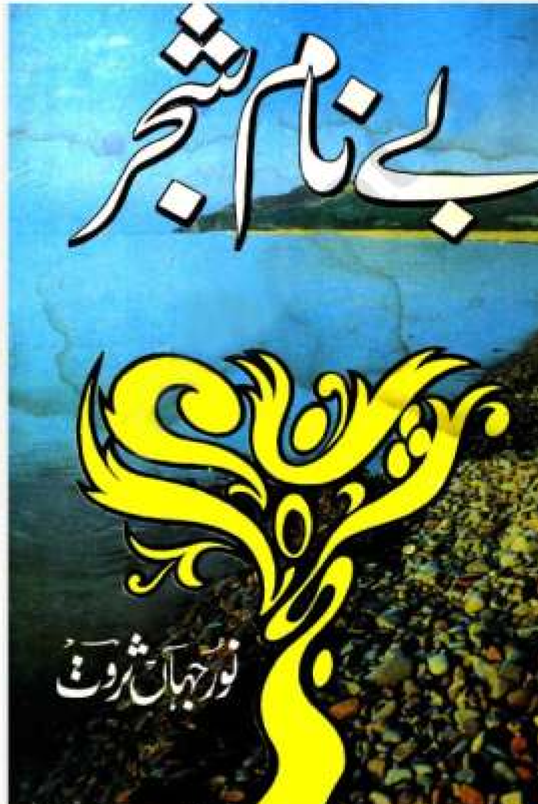

نور جہاں ثروت نے ان اشعار میں زندگی کی جو سچی تصویریں پیش کی ہیں ان سے کون ناواقف ہے؟ کہ معاشرتی جبر جسے سماجی، اقتصادی اور سیاسی سطح پر جھیلنا ہر ذی ہوش کا مقدر ٹھہرا ہے۔ جس کے نتیجے میں خلوص، اپنا پن اور شناسائی کے بجائے آج اجنبیت، بے گانگی اور بے حسی کا راج ہے، اس سے مفر کہاں؟ لیکن فنکار پر تو بہتر معاشرے کی تخلیق، تشکیل اور تعمیر کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے، وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کی بازیافت بھی کرتا ہے کیونکہ اپنی فطری حساسیت کی بدولت وہ کشادہ دل اور انسان دوست بھی ہوتا ہے۔ یوں تخلیق کار کی دردمندانہ شخصیت دوسروں کے درد میں شریک ہو کر اس کا مرہم بن جاتی ہے اور اپنی تخلیق کے ذریعے ہر حساس فن کاران تجربوں کو وجود عطا کرتا ہے جسے وہ زندگی کا حاصل جانتا، سمجھتا ہے۔ ثروت کی غزلیں اس احساس وفکر سے معمور ہیں:

مجھی پہ ختم ہوئیں دوست داریاں ساری
کہ میرے درد کا دامن بہت کشادہ تھا

ہمارے پاس تولے دے کے ہے یہ درد کی دولت
بڑے آرام سے اپنی گزر اوقات ہوتی ہے

اپنی تپش میں آپ جھلسنا تو فرض تھا
اکثر پرائی آگ میں جلنا پڑا مجھے

درد کی اسی دولت کو زندگی کا سرمایہ جان کر شانوں پر اٹھائے ہوئے ثروت اپنا سفر طے کرتی ہیں۔ اس عہد ریاکاری میں وہ سربلند ہو کر جینے کا ہنر جانتی ہیں۔ جب وقت کی تیز دھوپ جسم و جاں کو جھلسانے لگتی ہے تو 'بے نام شجر' کی چھاؤں میں دو گھڑی تھکن اتارنے اور تازہ دم ہونے کی خاطر ٹھہر جاتی ہیں۔ شاعرہ کے یہاں شجر علامت ہے قوت نمو کی، آرزو اور خواب کی، پناہ گاہ ہے معصوم اور بے زبان پرندوں کی، اشاریہ ہے، بہار و خزاں کے موسم کا، زندگی کی بدلتی رتوں کا، اپنی زمین اور اس کی گہری پھیلتی جڑوں سے وابستگی کا۔ اسی شجر کے سائے میں رک کر ثروت اپنی پلکوں سے گردِ سفر پوچھتی ہیں۔ تلوؤں سے صعوبتوں کے کانٹے چنتی ہیں۔ اور یادوں کے اوراق پلٹتی ہیں۔ یادیں جو گریزپا لمحوں کی بازیافت ہیں، معصوم اور لطیف ہیں، تنہائی کی غم گسار ہیں، جن میں تڑپ بھی ہے اور دبی دبی کسک بھی:

تمام عمر کا حاصل جسے میں سمجھی تھی
گزر گیا وہی لمحہ اداس کر کے مجھے

وہ اک لطیف سا جھونکا متاع جاں ثروت
چلا گیا ہے کدھر خوش لباس کر کے مجھے

میرے افکار کے ہم زاد رہا کرتے ہیں
کتنا آباد مرا گوشۂ تنہائی ہے

عکس تا عکس بدل سکتی ہوں چہرہ میں بھی
میرا ماضی مگر آئینہ دکھاتا ہے مجھے

قربتوں کی آنچ میں جلنے سے کچھ حاصل نہ تھا
کیسے کیسے لطف اب یہ فاصلہ دینے لگا

جو سلسلے رشتوں کے تھے سب ٹوٹ چکے ہیں
بس یادوں کے محراب پہ زنجیر بجی ہے

ان ہی یادوں نے ثروت کا رشتہ تہذیبی شعور اور عصری آگہی سے جوڑے رکھا ہے۔ ان کی شاعری دل کے زخموں کی کائنات بھی ہے اور

شعور و ادراک کی تجرباتی کی دنیا بھی۔ انھیں ذاتی تجربے کو کائناتی وسعت بخشنے کا ہنر خوب معلوم ہے۔ ان کے سچے تجربے روز مرہ کی زندگی سے حاصل کردہ ہیں۔ اس لیے ان کے اشعار عصری حقیقتوں کا آئینہ بن جاتے ہیں۔ جن میں عہد حاضر کے نشیب و فراز اور مسائل سے برسر پیکار انسانی وجود صاف نظر آتا ہے۔ ثروت کا جمالیاتی شعور انھیں شاعری کے دامن میں سمیٹ لیتا ہے:

پیاس جو بجھ نہ سکی اس کی نشانی ہوگی
ریت پر لکھی ہوئی میری کہانی ہوگی

جس سمت بھی جاؤں میں بکھر جانے کا ڈر ہے
اس خوف مسلسل سے مجھے کوئی نکالے

دست بستہ سب کھڑے رہتے ہیں اس کے روبرو
کس میں ہمت ہے جو کر لے قہر سامانوں سے بات

طے کرو اپنا سفر تنہائیوں کی چھاؤں میں
بھیڑ میں کوئی تمھیں کیوں راستہ دینے لگا
ہم اپنے غم کا بوجھ تو خود ہی اٹھائیں گے
اس شہر خوش سواد میں ہم راز کون ہے

تیشے مژہ کے نہر بہائیں گے نور کی
آنکھوں میں چھپے ہیں وہ منظر تراشئے

گردشِ روز و شب کی روح فرسا جبریت کے خلاف ان کی آواز بلند آہنگ یا جارحانہ نہیں بلکہ شائستگی کے ساتھ سر اٹھائے، اپنے وجود کے اثبات کا اصرار کرتی گفتگو کا سا انداز ہے۔ بناوٹ سے دور سادہ اور کھرے لہجے میں وہ ٹیس اور کسک ضرور ہے جو دل میں چبھ جاتی ہے۔ ان کی غزلوں میں نسائی رومانی احساس کی تصویریں بھی ہیں لیکن اس میں بھی بڑی وسعت ہے۔ وہ کسی نوعمر لڑکی کے جذباتی ردعمل کے بجائے ایک باشعور اور دیدہ ور نسائی فکر کی عکاس ہیں۔ آج کی زندگی میں جب عشق کے معنی بدل گئے ہیں تو ہجر و وصال کا رنگ بھی الگ ہونا لازمی ہے۔ اب نسائی ذہن محبوب کی آرزو میں جاں گھلانے، محافظ سمجھنے اور سہارا چاہنے کے بجائے اپنے بل پر زندہ رہنے کی جدوجہد کرتا نظر آتا ہے۔ تیز رفتار زندگی کے دور میں گرتے ہوئے تہذیبی اقدار اور رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کے درمیان جیتے ہوئے نور جہاں ثروت زندگی ہارتی نہیں یا غم زدہ نہیں ہوتیں بلکہ وقت کی بدلتی چال کے مطابق خود اپنی سوچ کے زاویے بدلتی ہیں۔ تنہا عورت کس فخر سے اپنے احساس و فکر کو پیش کرتی ہے۔ نمونہ دیکھیے:

ہم نے وفا نبھائی بڑی تمکنت کے ساتھ
اپنے ہی بل پہ زندہ رہے عمر کٹ گئی

عمر بھر دیکھا ہوا وہ آرزو کا خواب تھا
کتنی آسودہ ہوئی ہوں اپنے ہی انکار سے

نسبت ہی کسی سے ہے نہ رکھتے ہیں حوالے
ہاں ہم نے جلا ڈالے ہیں رشتوں کے قبالے

کوئی روانہ ہوا نذر یاس کر کے مجھے
اکیلا چھوڑ گیا ہے اداس کر کے مجھے

اک عمر سے میں ذات کے محبس میں بند ہوں
اب وقت کہہ رہا ہے کوئی در تراشئے
ہر ایک دور میں سچ کہہ کے سنگ سار ہوئے
ہمارے حق میں زمانے کا فیصلہ کب تھا

ایسا نہیں کہ انھوں نے آرزوؤں کا خواب نہیں دیکھا تھا یا ان کے دل کی وادی عشقیہ جذبوں کی رتوں سے ناآشنا تھی۔ بلکہ انسان کے اس فطری احساسات و کیفیات کے مختلف رنگ ان کے یہاں بھی موجود ہیں مگر نارسائی کی گرد اور ملال کی دھند میں لپٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بھلا حسن و عشق کی ہوش ربائی اور کرشمہ سازی سے انسان کہاں بچ سکتا ہے۔ رومانی فکر کے چند اشعار درج ہیں:

تمھارے نام کی مالا جپی ہے
ہماری چاہتوں کا پوچھنا کیا

ایک بھی دیپ نہ یادوں کے بجھانے دے گا
میری آنکھوں کو وہی خواب پرانے دے گا

رفاقتوں نے دیے ہیں مجھ کو عداوتوں کے عذاب سارے
مرے ہی دل پر ہوئے ہیں نازل محبتوں کے عذاب سارے

وہ خوشبوؤں کا لباس پہنے ملا کچھ ایسے کہ ایک پل میں
پڑے ہوئے تھے جو جسم و جاں پر اتر گئے وہ نقاب سارے
سوال سادہ سا زندگی سے کیا تھا ہم نے بھی ایک ثروت
وہ پتھروں کی ہوئی ہے بارش کہ مل گئے ہیں جواب سارے

تنہائیوں کی برف پگھلتی نہیں ہنوز
وعدوں کے اعتبار کی بھی دھوپ چھٹ گئی
ثروت ہر ایک رت میں لپیٹے رہے جسے
وہ نا مراد آس کی چادر بھی پھٹ گئی

اوروں پہ اثر کیا ہوا اس ہوش ربا کا
بس اتنی خبر ہے مرا ایمان گیا ہے
رہنے لگا دل اس کے تصور سے گریزاں
وحشی ہے مگر میرا کہا مان گیا ہے

احتیاطیں تھیں مناسب جب ساعت تھی بجا
اب تو اپنے دل کی سب کہنے لگے دیوار سے

مجموعی اعتبار سے نور جہاں ثروت کی غزلیں تہذیبی قدروں بالخصوص انسانی رشتوں کے شکست وریخت کا جمالیاتی اظہار ہیں۔ان کے اشعار میں زخمی روح کی سرگوشیاں ہیں۔انھوں نے اپنے اطراف اور اپنی زندگی میں رونما ہونے والے ستم وجبر کو غنائی اور مترنم لہجے میں پیش کیا ہے۔ وہ غزل کی رمزیت، وسعت اور پراسرار سمتوں سے خوب واقف ہیں اس لیے ان کی غزلیں باطنی کیف اور فکری جہت کی ہم آہنگی کا خوب صورت امتزاج بن گئی ہیں۔شجر کا رمزیہ پیکر کہیں شادابی، کہیں اداسی، کہیں تنہائی اور کہیں یادوں کا گھنا سایہ بن کر جلوہ دکھا رہا ہے۔بہرکیف ثروت کی غزلیں جدید نسائی فکر کا دلآویز نمونہ ہیں۔

(ماخوذ: نسائی شعری آفاق، کہکشاں تبسم، تاج آفسیٹ پریس، پٹنہ، 2015)

□□□

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا / چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ / منی آرڈر.................................. بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

شاعرات کے منتخب اشعار

خواہش زیست کو ہم نے ہمہ تن چھوڑ دیا
روح نے تیری تجسس میں وطن چھوڑ دیا

منزل گور سے جانا ہے مجھے سوئے عدم
تا سبک سار رہوں بار کفن چھوڑ دیا

راضیہ خاتون جمیلہ

غلط کہ چشمۂ مذہب میں اب مٹھاس نہ ہو
عبث ہے اب یہ بقا بھی جو تم کو پیاس نہ ہو

لبالب ہیں جہاں میں ہفت قلزم آبِ صافی سے
صدف پھر کس لیے اک بوند پانی کو ترستی ہے

امیہ بیگم شروانی

محبت کیا؟ حکومت دل پہ زنجیر سلاسل کی
شکایت کیجیے کس سے جنوں انگیزیٔ دل کی

وفور شوق میں کب تھی تمیز مشکل و آساں
جناب عشق نے آساں مری ہر ایک مشکل کی

نثار فاطمہ کبریٰ

گیسوئے شاہ عرب صلے علیٰ
میرا مونس ہے شب تنہائی کا

ہوش ہیں جلووں سے اڑتے ہر طرف مثلِ پری
کوچے کوچے پر مدینہ کے ہے عالم قاف کا

محمودہ خاتون محمودہ

دل سے کہہ دو کہ ہوئی جاں بھی ہدف تیر بلا
کام آئی نہ مری جاں تیری سینہ سپری

راز داروں کے چھپائے نہ چھپا میرا جنوں
اڑ گئی ہوش کی صورت خبرِ بے خبری

ز۔خ۔ش

قطرے قطرے کو بھریں تیرے سبوکش لاچار
ہے یہ کس کے لیے عبرت کا مقام اے ساقی

حقیقت کے منافی ہے تری موجودہ بیداری
کہ تجھ میں بندۂ مومن کی قہاری نہ غفاری

زیب عثمانیہ

مرہم سے بے نیاز ہیں پنہاں یہ زخم دل
کیا کیا فسوں ہے چشم دل آرا لیے ہوئے

کیا خبر تھی اس طرح لٹ جائے گا یہ کارواں
کیا پتہ تھا در پے آزار ہے یوں آسماں

رابعہ پنہاں

چمن میں پھول ہوں، گل میں بہ رنگ بو ہوں
کہیں تعبیر ہستی ہوں، کہیں خواب پریشاں ہوں

بشیر اب گردش شام و سحر کی یاد باقی ہے
کہاں تک ساتھ دے سکتے زمین و آسماں اپنا

بشیر النساء بیگم بشیر

ڈاکٹر حمیرہ تسنیم

ناولٹ نگار اردو خواتین

ادبی دنیا میں نثر نگاری سے قبل شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ اردو زبان وادب پر بھی اس نظریہ کا اطلاق ہوتا ہے' چنانچہ سب سے پہلے شاعری کے بعد اردو زبان میں اٹھارہویں صدی میں نثر کا رجحان فروغ پانے لگا۔ یہ بھی اہم حقیقت ہے کہ تخلیقی ادب میں قصہ گوئی اور اس کے بعد داستان نویسی کا رواج عام ہوا۔ اردو میں داستان کے بعد ناول نگاری کی طرف توجہ دی گئی۔ ناول نگاری کے سفر کے ساتھ افسانوی نثر کے ذریعے طویل اور مختصر افسانے تحریر کیے گئے جس کے بعد مختصر سے مختصر اور کم سے کم کرداروں پر مشتمل المیہ یا طربیہ انداز سے وابستہ مختصر ناول کو انگریزی ادب میں ناولٹ کا درجہ دیا گیا۔ اسی انگریزی ادب کی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر اردو داں طبقہ نے ناولٹ نگاری کی طرف توجہ دی۔ بلاشبہ اردو میں ناولٹ نگاری کے انداز کو فروغ ''ترقی پسند ادبی تحریک'' کے ذریعہ 1936 کے بعد ہوا۔ اس سے قبل اور بعد بھی اردو نثر میں مرد حضرات ہی نہیں بلکہ خواتین کی اچھی خاصی تعداد ناول نگاری کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ خواتین نے موضوعات مسائل اور سماج کی اونچ نیچ پر بھی بہترین ناول لکھے۔ اسی طرح خواتین کا رجحان ناول نگاری سے ناولٹ نگاری کی طرف ہوا۔ خواتین میں ناول نگاری کی ابتدا انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ہوئی' بیسویں صدی کی نصف دہائی تک عورتوں کے ناول منظر عام پر آنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیبی' سیاسی' سماجی اور تعلیمی حالت انتہائی بدتر یعنی زوال پذیر تھی۔ مسلم معاشرہ میں فرسودہ رسم و رواج اور غیر مذہبی طریقے معاشرت میں شامل ہو چکے تھے۔

نذیر احمد کے لکھے ہوئے ناولوں میں مراۃ العروس' بنات النعش اور توبۃ النصوح کے مطالعہ سے اس دور کی مسلم خواتین کی اہمیت' حقیقت اور مرتبہ کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی دوران راشد الخیری نے اپنے ناولوں میں عورتوں کی تعلیم اور اس کی اہمیت کے علاوہ خواتین کی مجبوری اور مظلومیت کو بھی ناولوں میں شامل کیا۔ اسی دور میں پڑھنے لکھنے والی خواتین کی کثیر تعداد وجود میں آئی۔ ایسی ہی پڑھی لکھی خاتون میں رشیدۃ النساء ہیں' جنھوں نے ''اصلاح النساء'' جیسا قصہ 1884 میں پیش کیا۔ اردو کے ناقدین نے ''اصلاح النساء'' کو خواتین کے پہلے ناول کی حیثیت سے سرفراز کیا ہے۔ رشید النساء کے بعد محمدی بیگم کا نام آتا ہے' جنھوں نے رسالہ ''تہذیب نسواں'' کی ادارت کی۔ ان کے کئی ناول شائع ہوئے' جن کی سماجی خدمات بھی خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ محمدی بیگم کے بعد اکبری بیگم کا نام ''گلدستہ محبت'' کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے' جسے ان کا پہلا ناول قرار دیا گیا ہے۔ ''گودڑ کا لال'' اکبری بیگم کا دوسرا ناول ہے۔ اس ناول کو خاصی شہرت نصیب ہوئی اور لڑکیوں کو جہیز میں دیا جانے لگا۔ ان خواتین کے علاوہ عباسی بیگم اور زہرا بیگم بھی بہت مشہور ہوئیں۔ غرض خواتین کی ناول نگاری میں طیبہ بیگم اور صغریٰ ہمایوں مرزا کا نام بھی حد درجہ احترام سے لیا جاتا ہے۔

ناول کی انتہائی شستہ اور صاف ستھری شکل ناولٹ ہے۔ جس میں ایک ہی قصے کے تحت دو تا چار کردار پر مشتمل پلاٹ اور مکالمے ہی نہیں بلکہ قصہ کے بیانیہ میں تخلیقی حسیت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ المیہ' الم طربیہ یا پھر طربیہ کے امکانات پیش کیے جاتے ہیں۔ ناولٹ بلاشبہ ''ناول'' کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے' تمام اصناف کی طرح یہ صنف بھی انگریزی سے اردو میں منتقل ہوئی ہے۔ فن کے اعتبار سے ناول اور ناولٹ میں فرق یہ ہے کہ ناول میں کئی کرداروں کو شامل کیا جاتا ہے' جبکہ ناولٹ میں ایک یا ایک سے زائد کردار ہوتے ہیں۔ ان ہی کرداروں میں قصہ یا کہانی بیان کی جاتی ہے اور کرداروں کے عمل کی تخلیق کی جاتی ہے۔ ناولٹ کے فن کا آغاز درحقیقت ترقی پسند تحریک کے ادیبوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انسان کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کی وجہ سے داستانوں کو زوال ہوا' پھر طویل ناولوں کے بعد مختصر ناولوں کا چلن عام ہوا۔ ناول کی صنف کی خصوصیات ناولٹ میں شامل ہوتی ہیں' صرف کرداروں کی تعداد حد درجہ کم ہوتی ہے۔ ناول کی تکنیک کی طرح ناولٹ کی بھی وہی تکنیک قرار دی گئی ہے۔ البتہ ناول کی بہ نسبت ناولٹ میں کم کردار ہوتے ہیں۔

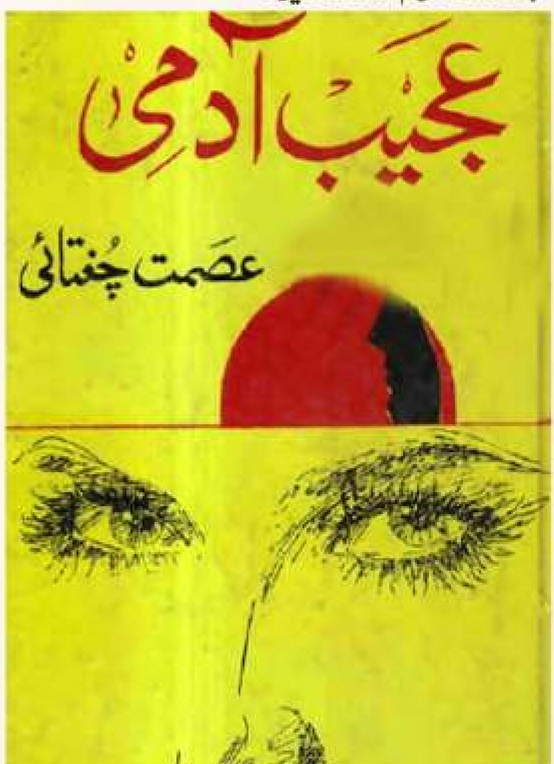

Novel سے ہی لفظ ناولٹ وجود میں آیا ہے۔ ناولٹ سے معنی مختصر ناول کے لیے جائیں گے۔ انگریزی زبان میں صیغہ تصغیر بنانے کے لئے Let کا استعمال ہوتا ہے جیسے BookLet' OutLet' BrossLet وغیرہ اردو میں اسم تصغیر کے لیے ''چہ'' کا استعمال ہوتا ہے جیسے باغ سے باغیچہ' طاق سے طاقچہ اور صندوق سے صندوقچہ وغیرہ۔ اس طرح NoveLet کے لیے اردو میں تصغیر لگا کر ''ناولچہ'' کہا جاسکتا ہے۔ ناولٹ میں ناول، افسانے اور ڈرامے میں استعمال کیے جانے والے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ ناولٹ کے تمام موضوعات انسانی زندگی سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ناولٹ انسانی زندگی کے حالات سے حد درجہ قریب ہوتا ہے، بلکہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا عکس قرار دیا جاتا ہے۔ ناولٹ میں اختصار کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ناولٹ کا فن دراصل ناول سے قریب اور افسانے سے دور ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اگر تاریخی پس منظر میں ناولٹ پر غور کیا جائے تو سب سے پہلے رتن ناتھ سرشار کی تخلیقات میں ناولٹ کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ رتن ناتھ سرشار کے دو اہم قصے ''پی کہاں'' اور ''ہشو'' کو بھی ناولٹ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد نیاز فتح پوری کا تحریر کردہ طویل افسانہ ''شہاب کی سرگزشت'' کو بھی اہم ناولٹ کا درجہ دیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں سجاد ظہیر کے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' اور راجندر سنگھ بیدی کا بیانیہ ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' کو اردو کے مشہور ناولٹ کا درجہ حاصل ہوا۔ خواتین میں رضیہ سجاد ظہیر کے ناولٹ ''سرشام'' کے ادبی موقف کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔

عام طور پر ناولٹ نگار خواتین کا موضوع ہمیشہ حویلیوں اور حویلیوں میں پیش آنے والے واقعات اور جاگیردارانہ طبقہ کا ماحول رہا ہے۔ انہوں نے اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک کو بسانے کے رجحان اور عورتوں کا استحصال جیسے اہم موضوعات کو اکثر ناولٹ نگاری میں شامل کیے ہیں۔ عصمت چغتائی کا ناولٹ ''عجیب آدمی'' ہے۔ اس ناولٹ میں فلمی دنیا سے سبق لینے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ یعنی اس ناولٹ کے ذریعہ فلمی دنیا کے ماحول کو پیش کر کے اس کی غیر فطری حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس ناولٹ میں مرکزی کردار ہیرو ''دھرم دیو'' ہے جو کہ وہ ایک مشہور ہیرو ہے۔ جو منگلا سے محبت کرتا ہے اور شادی ہو جاتی ہے' پھر زرینہ سے دوستی کرتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کو نظر انداز کرتا ہے اور بعد میں وہ پریشانیوں میں الجھ جاتا ہے۔ اسی الجھن میں دوست اس کو ایک طوائف کے پاس لے جاتے ہیں' اس طرح سے ان تینوں کے بیچ اس کی زندگی الجھ کر رہ جاتی ہے۔ آخر کار وہ

موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔اس طرح ناولٹ کے ذریعہ فلم کی غیر فطری زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔

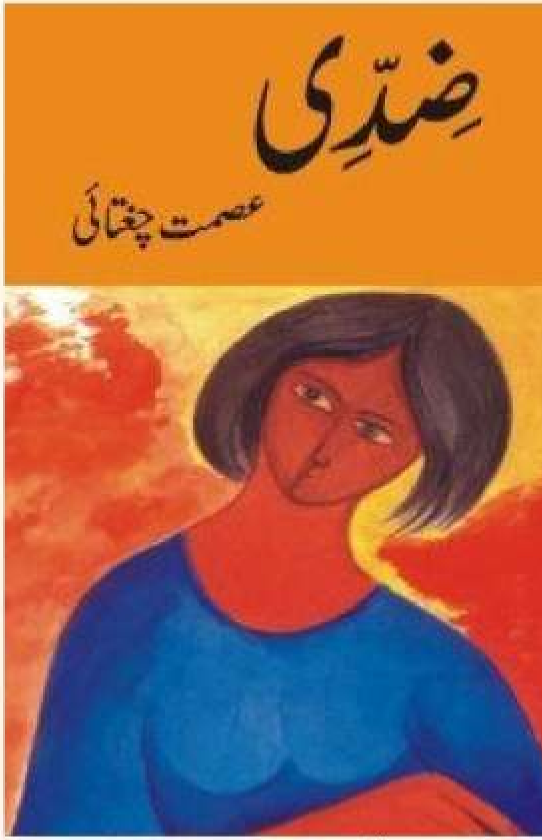

عصمت چغتائی کو اردو ادب میں افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے علاوہ خاکہ نگاری کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل ہے۔جس طرح انھوں نے ''عجیب آدمی'' لکھ کر ناولٹ نگاری کی بنیاد رکھی' اسی طرح ان کا دوسرا ناولٹ ''ضدی'' موضوعاتی سطح پر محبت کے جذبہ کو نمایاں کرنے کی دلیل پیش کرتا ہے۔اس ناولٹ میں عصمت چغتائی نے محبت کے فطری جذبہ کے ساتھ متوسط طبقہ کے لوگوں کی زندگی کے کھوکھلے پن اور مصنوعیت کی بھی نمائندگی کی ہے۔ ناولٹ کا اختتام المیہ صورتحال پر ہوتا ہے۔ اس ناولٹ کا مرکزی کردار پورن ہے۔ ضمنی طور پر ناولٹ میں کئی کردار نمایاں ہیں' جن میں راجا صاحب کا خاندان' نوکرانیاں' ناولٹ کی ہیروئین آشا' جس کا تعلق نچلے طبقے سے ہے' جو راجا صاحب کے گھر میں نوکرانی کی حیثیت سے کام کرتی ہے' پورن کو اس سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ آشا سے شادی کرے' لیکن گھر کے لوگ مخالفت کرتے ہیں۔ اس ناولٹ میں خاندان کے وقار اور سماج میں مقام کھو جانے کا المیہ بیان کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح ہندوستانی معاشرے میں خاندان اور معاشرے کو اہمیت دیتے ہوئے جذبات کو ثانوی حیثیت دی جاتی تھی۔غرض پورن اپنی ضد پر قائم رہتا ہے' خود آشا بھی اسے اپنی سماجی حیثیت کا احساس دلاتی ہے' کیونکہ وہ خود غریب اور دیہاتی لڑکی ہے۔اس طرح اس ناولٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب پورن سنگھ نحیف ہو کر شادی نہ ہونے کی وجہ سے بیمار ہو جاتا ہے تو اس کی تیمارداری کے لیے آشا کو گاؤں سے بلایا جاتا ہے' اس طرح ناولٹ کے اختتامی مرحلہ میں پورن کی موت اور آشا کی زندگی کے خاتمہ کے ذریعے حقیقت نگاری کے بجائے عصمت چغتائی نے رومانیت کے جذبہ کی نمائندگی کی ہے۔

اردو میں افسانہ اور ناول ہی نہیں بلکہ ناولٹ کے فن کو فروغ دینے میں عصمت چغتائی کے ناولٹ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے تیسرے ناولٹ کی حیثیت سے ''دل کی دنیا'' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بلاشبہ عصمت چغتائی نے اس ناولٹ کے ذریعے سماجی مسائل کی نمائندگی کی ہے' جس میں انھوں نے معاشرے میں پھیلے فرسودہ رسم و رواج اور فرسودہ ذہنیت کی نشاندہی کی ہے۔اس ناولٹ میں قدسیہ بیگم کو ہیروئین کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو شوہر کی بے وفائی اور نفرت کا شکار ہو کر ''بوا'' سے مدد حاصل کرتی ہے اور اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر شوہر کے بجائے شبیر حسین سے عشق کر بیٹھتی ہے۔ آخر میں اس کا برا انجام سامنے آتا ہے۔اس طرح اس ناولٹ میں عصمت چغتائی نے مرد کی لاپرواہی کی وجہ سے عورت کے ذہن پر مرتسم ہونے والے اثرات اور اس کی سماجی ہی نہیں' بلکہ معاشی اور معاشرتی خرابیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔اس طرح تاریخی پس منظر میں عصمت چغتائی کے تین ناولٹ اہمیت کے حامل ہیں۔عصمت چغتائی کے بعد اردو نثر میں سب سے طویل اور سب سے زیادہ ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ناولٹ لکھنے والی خاتون کی حیثیت سے قرۃ العین حیدر کا نام لیا جاتا ہے۔انھوں نے کئی ناولوں کے علاوہ اردو ناولٹ کی روایت کو فروغ دیتے ہوئے وقفہ وقفہ سے پانچ ناولٹ پیش کیے' جن کے نام ''سیتاہرن''۔''چائے کے باغ''۔''دل ربا''۔''اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو''۔اور''ہاؤسنگ سوسائٹی'' ہیں جن کے ذریعے قرۃ العین حیدر کی ناولٹ نگاری کے فن کو ہمہ گیر شہرت حاصل ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ہند کے بعد فسادات کے علاوہ ہجرت سے متعلق قرۃ العین حیدر کا ناولٹ ''سیتاہرن'' اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناولٹ میں سیتا کو مرکزی کردار عطا کیا گیا ہے جبکہ جمیل' قمر الاسلام چودھری' عرفان' برجش کمار چودھری جیسے کردار اہمیت کے حامل ہیں۔اس ناولٹ میں موجودہ

عورت کی کہانی اور اس کی بے بسی کا اظہار کیا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر کے دوسرے ناولٹ کی حیثیت سے ''چائے کے باغ'' کی کہانی تین دوست شمشاد، قاسم اور واجد پر مشتمل ہے۔ان تینوں دوستوں کی گفتگو یہی ہے کہ دنیا ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔تینوں دوستوں کو مختلف نوکریوں میں کام کرنے کا موقع ملتا ہے،اس ناولٹ میں شمشاد کی شادی صادقہ سے ہوتی ہے پھر صادقہ، صنوبر کی حیثیت سے شہرت حاصل کرتی ہے، جب شمشاد دوسرے ملک کو جاتا ہے تو صنوبر قاسم سے پیار کرتی ہے اور پھر ان کی شادی بھی ہوجاتی ہے۔اس طرح عورت کی نفسیات اور مرد کی نفسیات کو اس ناولٹ میں پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ عورت جنس کی متلاشی رہتی ہے، جبکہ مرد کو دولت کے حصول کی خواہش رہتی ہے۔یہ پورا ناولٹ دنیا نہ سمجھنے آنے والی جگہ اور عورت کی جنسی خواہش کی وضاحت کرتا ہے۔

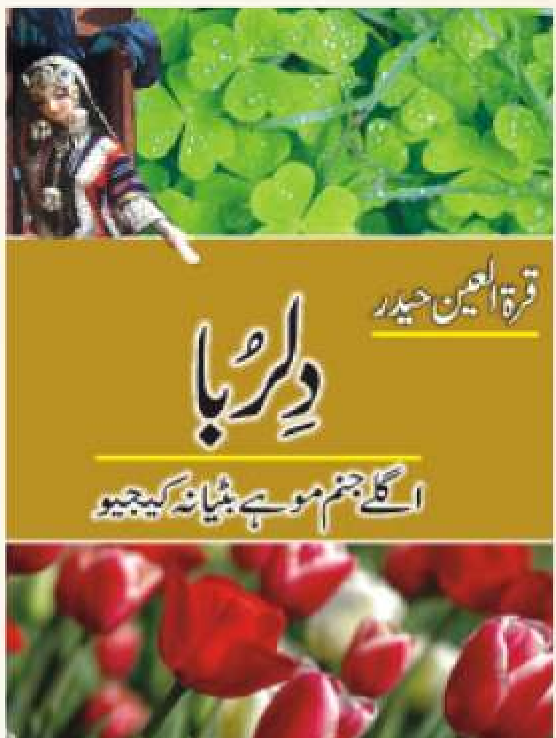

قرۃ العین حیدر نے تیسرے ناولٹ کی حیثیت سے ''دل ربا'' کی نمائندگی کی ہے۔بلاشبہ قرۃ العین حیدر کو اردو فکشن کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کرنے والی خاتون کا درجہ حاصل ہے۔جنھوں نے باقاعدہ مغربی فکشن سے استفادہ کرکے اردو فکشن کو مغربی افکار سے آراستہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ان کے ناولٹ تخلیقی سطح پر بلند اور زبان اور اسالیب کا بہترین مظاہرہ کرتے ہیں۔ان کا ناولٹ ''دل ربا'' درحقیقت اودھ کی جاگیرداری تہذیب کے مٹتے ہوئے نقوش اور اخلاق اقدار کی شکست کی نمائندگی کرتا ہے،جس میں شریف خاندانوں کی تباہ حالی اور بدلتے ہوئے اقدار کی نمائندگی کی گئی ہے،جس میں لکھنؤ کے ایک ایسے خاندان کا ذکر کیا گیا ہے،جس میں چار لڑکے اور ماں باپ موجود ہیں،جو چھپ کر برقعہ پہنتے اور ناٹک دیکھنے جاتے ہیں اور اتفاق سے تھیٹر کی اداکارہ گلنار کے ڈریسنگ روم تک پہنچ جاتے ہیں۔اس ناولٹ میں زمانی اور مکانی اعتبار سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ سید شجاعت حسین ضلع ہردوئی کے تعلقہ دار اور کریم پور کے نواب کی حیثیت سے اہمیت کے حامل تھے۔وہ جب اپنے مقدمہ کی کارروائی کے لیے دلی جاتے ہیں تو ان کے لڑکے بھیس بدل کر ناٹک دیکھتے اور اس کے ذریعے شریف خاندان کی روایت کو نظر انداز کرتے طوائف کی زندگی سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔اس طرح قرۃ العین حیدر نے یہ بتایا ہے کہ شریف خاندان کے لوگ اخلاقی اور سماجی زوال کے بعد عیش پرستی اور بے حسی کا شکار ہوجاتے ہیں۔اس ناولٹ میں شریف خاندان کی تباہی کا المیہ دلچسپ انداز سے پیش کیا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر کو منظر نگاری اور تخلیقی خصوصیت کو پیش کرنے میں بڑا کمال حاصل ہے۔انھوں نے اپنے تمام ناولٹ میں اسی تہذیب کی نشاندہی کی ہے،جو نوابی تہذیب کا درجہ رکھتی تھی اور رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوگئی،بلاشبہ ان کے ناولٹ میں لکھنؤ کی اجڑتی تہذیب کا المیہ دکھائی دیتا ہے۔اپنے ناولٹ ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' میں دو اہم کردار رشک قمر اور جمیلن کے ذریعے اس ناولٹ میں زندگی کی مختلف نوعیتوں کی نمائندگی کی گئی ہے۔اس ناولٹ میں دو غریب لڑکیوں کی درد بھری زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے،جو زندگی گزارنے کے لیے عرسوں اور میلے، ٹھیلے میں گا بجا کر کچھ کما لیتی تھیں۔جمیلن اپاہج ہے جو چھوٹی بہن ہے اور وہ ڈپٹی صاحب کے مکان کے ایک حصہ میں کرایہ دار ہے۔ڈپٹی صاحب کا لڑکا اور اس کا ایک دوست نریندر کمار ورما نے یہ سوچا کہ ان مجبور لڑکیوں کے مستقبل کو سنوارنا چاہیے،اس لیے انھوں نے آرٹ اور کلچر کی خدمت کی کوشش کی،جس کے ذریعے وہ ان محروم لڑکیوں کی مدد کرتے ہیں، لیکن لڑکیاں ہونے کی وجہ سے ان پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں۔اس ناولٹ میں زمینداروں کی تقاریب اور مختلف بھانڈوں کے کرتب کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد سماجی اور انسانی طور پر المیہ کیفیت اُمڈ کر چلی آتی ہے۔بنیادی طور پر قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں اور ناولوں ہی نہیں،بلکہ ناولٹ میں بھی عورتوں کی مظلومیت اور مصیبت کی نمائندگی کی ہے اور ان عورتوں میں اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین ہی

نہیں، بلکہ غیر تعلیم یافتہ عورتیں بھی شامل ہیں۔ اس طرح آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی مشرقی ممالک میں عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم کو نمائندگی دینے میں قرۃ العین حیدر پوری طرح کامیاب ہیں۔ اپنے ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' کے ذریعے قرۃ العین حیدر نے تقسیم ہند سے پیدا ہونے والی سماجی صورتحال کو پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ تہذیب اور اقدار ہی نہیں بلکہ اخلاق کے علاوہ شائستگی بھی برصغیر سے رخصت ہوگئی۔ اس ناول میں تہذیب کے عروج وزوال کو پیش کیا گیا ہے، جس کے اہم کردار سید جمشید علی اور سلمان ہے۔ جمشید ایک خوددار اور حالات کا شکار انسان ہے، جبکہ سلمان اعلیٰ طبقے کا امیر اور استحصالی قوتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ غرض اس ناولٹ کے ذریعے بھی یہ بتایا گیا ہے کہ اخلاقی پستی کا یہ عالم ہے کہ ایک غریب آدمی رہنے کے لیے ٹھکانہ تلاش کرے تو مالدار طبقہ تمام تہذیبی اقدار کو نظر انداز کر کے استحصال کا طریقہ اپناتے اور انسانیت کو تباہ و تاراج کرنے کے علمبردار ہوتے ہیں، اس طرح تخلیقی سطح پر اس ناولٹ کے ذریعے بھی سماجی ناانصافی اور اعلیٰ وادنیٰ طبقے کی کشمکش کو قرۃ العین حیدر نے موضوع بنایا ہے۔

اردو کی ناولٹ نگار خواتین میں حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی تخلیقی قلم کاروں میں جیلانی بانو اور ان کے کارناموں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جیلانی بانو کا پہلا ناولٹ ''جگنو اور ستارے'' ہے۔ اس ناولٹ میں انھوں نے تین ناولٹوں کو یکجا کیا ہے، جن کے الگ الگ نام (1) دیکھیں کیا گزرے ہیں قطرے پہ (2) جگنو اور ستارے (3) رات یا ماتم ایک شہر آرزو۔ اس ناولٹ میں جیلانی بانو نے فانی بدایونی کے سوانحی خاکہ کو افسانوی پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ فانی بدایونی کے کردار کی نمائندگی اظہر کے ذریعے کی گئی ہے اور جیلانی بانو کا امتیاز یہی ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقی طاقت کے ذریعے فانی بدایونی کے عہد معاشرت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس ناولٹ میں حیدرآبادی تہذیب اور اس علاقہ کے ماحول کے علاوہ ادبی سرگرمیوں کا پس منظر ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے ناولٹ میں انھوں نے حیدرآباد کے آخری نظام کے زمانے کے جاگیردارانہ سماج کی داستان پیش کی ہے اور اس میں بتایا ہے کہ کس طرح حیدرآبادی ماحول میں پولیس ایکشن ہوا اور نظام کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اس ناولٹ میں اخلاقی پہلو نمایاں ہوتا ہے، جس کے ذریعے جاگیردارانہ نظام کی خصوصیات کی نمائندگی کی گئی ہے۔ ''جگنو اور ستارے'' کے کردار چاند، صادق میاں، حیات، گوری ماں اور نواب جانی وغیرہ ہیں۔ بلاشبہ یہ ناولٹ واقعہ اور کردار کی نمائندگی میں بہترین اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''رات یا ماتم ایک شہر آرزو'' کے ذریعے جاگیرداری نظام کے خاتمہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے اس ناولٹ کو تین مناظر یعنی صبح، دوپہر اور شام کے ذریعے واضح کیا ہے۔ صبح کے منظر میں سعادت علی کی تین لڑکیاں سلمیٰ، ستارہ اور پروین کو پیش کیا گیا ہے۔ دوپہر کے منظر میں سعادت علی کے والد کی شاہ خرچی اور فضول کاموں کی نمائندگی کی گئی ہے، جو عبادت علی کے نام سے مشہور ہیں، اس کے برخلاف سعادت علی کو کنجوس بتایا گیا ہے اور شام کے منظر میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ تینوں لڑکیاں ریاض نامی لڑکے پر فدا ہیں۔ اس طرح ایک حیدرآبادی مسلمان خاندان کو پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ حیدرآباد میں جاگیرداری نظام کے خاتمہ کے بعد پیدا ہونے والی سماجی اور معاشرتی بے اعتدالیوں میں محبت کے بڑھتے ہوئے سفر کی بے اعتدالی اور ایک مرد سے تین لڑکیوں کی محبت کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔

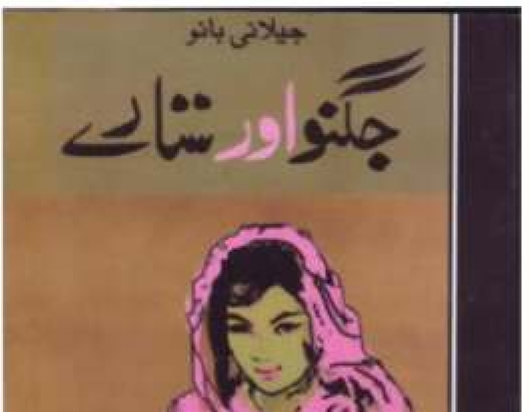

جیلانی بانو نے ایک اور ناولٹ ''نغمے کا سفر'' تحریر کیا ہے۔ اس مجموعہ میں چار ناولٹ شامل ہیں۔ (1) اکیلا (2) پتھر کا جگر (3) کیمیائے دل (4) نغمے کا سفر۔ ان چاروں ناولٹ میں عصری معاشرے کی نمائندگی کرتے ہوئے جیلانی بانو نے پہلے ناولٹ ''اکیلا'' میں ایک ایسے بچہ کی کہانی پیش کی ہے جو بن بیاہی ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے ناولٹ ''پتھر کا جگر'' کے ذریعے تخلیق کار نے ادبی دنیا کے اس پراگندہ ماحول کو پیش کیا ہے

جو حیدرآباد کی تہذیب میں آپسی چشمک کا ذریعہ بنا اور جو اس دور کی تہذیب کا المیہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا تیسرا ناولٹ ''کیمیائے دل'' بھی حیدرآباد کی تہذیب کی نمائندگی کرتا اور جاگیردارانہ اقدار کی شکست کا المیہ سناتا ہے۔ ناولٹ کے عنوان کے تحت ''نغمے کا سفر'' جیسے ناولٹ میں انھوں نے نوابی خاندان کے گھناؤنے روپ کو پیش کر کے اس عہد کی عکاسی کا حق ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ناولٹ ''گڑیا کا گھر'' عورت کے رومانی جذبات کے پس منظر میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دلفریب ماحول کی نشاندہی کرتا ہے۔ انھوں نے ایک اور ناولٹ ''اپارشن'' تحریر کیا' جس میں حیدرآباد کے ایک جاگیردار مسلم گھرانے کے افلاس میں مبتلا خاندان کی نشاندہی کی گئی ہے۔

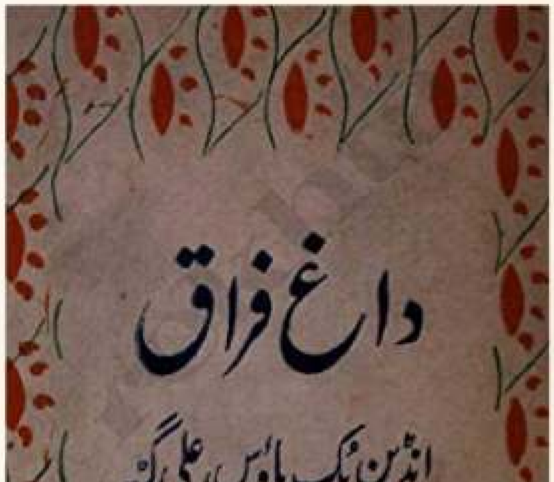

اردو کی خواتین ناولٹ نگاروں میں تخلیقی صلاحیتوں کی مالک اہم خواتین میں شکیلہ اختر' آمنہ ابوالحسن اور جمیلہ ہاشمی کے ناولٹ کو بھی ادبی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ تخلیقی حیثیت سے بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ شکیلہ اختر نے تین ناولٹ (1) منزل (2) سرحدیں (3) تنکے کا سہارا پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ ناولٹ کے فن میں خواتین نے بھرپور حصہ ادا کیا ہے۔ تکنیکی لحاظ سے شکیلہ اختر نے ''منزل'' کی کہانی کا آغاز اختتام سے کیا ہے۔ بدلتے ہوئے ماحول کے پس منظر میں ناولٹ کو مرکزی کردار زاہدی کے ذریعے پیش کیا گیا ہے' جو گاؤں میں تعلیم حاصل کر کے میڈیکل کالج کی تعلیم کے لیے پٹنہ آجاتا ہے۔ جب وہ تعلیم حاصل کر کے دوبارہ پٹنہ پہنچتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے کمرہ میں کوئی اور بوڑھیا اور سلمٰی موجود ہیں' اسے حیرت ہوتی ہے۔ غرض اس کے چچانے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ زاہدی کی شادی ان کی بیٹی آمنہ سے کی جائے' لیکن آمنہ اپنے خالہ کے لڑکے برکت علی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے' اس طرح اس ناولٹ کے ذریعے شکیلہ اختر نے ثابت کیا ہے کہ وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسان کے خیالات اور حالات بھی بدل جاتے ہیں۔ غرض اس ناولٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو زندگی میں آسودگی حاصل نہیں' وہ گاؤں میں ہی نہیں بلکہ شہر میں بھی سکون حاصل نہیں کر سکتا۔ شکیلہ اختر کا دوسرا ناولٹ ''سرحدیں'' دیہاتی ماحول کو پیش کر کے سماج کے نچلے طبقے کی نشاندہی کرتا ہے۔ دیہاتی سماج کی نمائندگی میں مہاجن اور ساہوکار کے علاوہ غریبوں اور مزدوروں کی نمائندگی اور ان کا ہر سطح پر ہونے والا استحصال اس ناولٹ کا اہم موضوع ہے' جس میں اسلم خاں اور دوسرے کردار موجود ہیں' جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہمدردی کے بجائے استحصال کے ذریعے لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہیے' شکیلہ اختر کا تیسرا ناولٹ ''تنکے کا سہارا'' بھی سماجی طور پر انسانی تعلقات کے بدلتے ہوئے حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس ناول میں ایک ایسے ڈاکٹر کا کردار پیش کیا گیا ہے جو شادی کر کے انگلینڈ چلا جاتا ہے لیکن واپس نہیں آتا' جس کے نتیجہ میں مسز لال دوستوں اور محفلوں کی رونق بن جاتی ہیں' اس طرح یہ ناولٹ بھی شکیل اختر کے فن کی نمائندگی کرتا ہے۔

خواتین ناول نگاروں میں آمنہ ابوالحسن کے ناولٹ ''آخری دن'' کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس ناولٹ کے مرکزی کردار کے ذریعے تخلیق کار نے فطری طریقہ سے نفسیاتی مطالعہ کی کوشش کی ہے۔ ناولٹ کا مرکزی کردار اقبال ہے' وہ معصوم اور سادہ لوح ہونے کے علاوہ اپنی بہن ارجمند سے بے انتہا محبت کرتا ہے' لیکن اقبال بکثرت سونیا سے ملتا ہے' جو اس کی ماں کو گراں گزرتا ہے' جس کے بعد اس کی ملاقات بلقیس نامی لڑکی سے ہوتی ہے' وہ بلقیس سے شادی کرنا چاہتا ہے' لیکن بلقیس لطف حاصل کرنے کا ذریعہ بنی رہتی ہے۔ اقبال کی ملاقات تیسری لڑکی عائشہ سے ہوتی ہے اور محسوس کرتا ہے کہ عورتوں کی رغبت مرد سے لطف اندوزی کی حد تک ہے' اس دوران وہ اپنی بہن ارجمند کو بھول جاتا ہے' جس کی ملاقات اختر نامی نوجوان سے ہوتی ہے' جو شراب خانہ چلانے کے ساتھ ساتھ قحبہ گری بھی کرتا ہے۔ اس طرح آمنہ ابوالحسن نے اپنے ناولٹ ''آخری دن'' کے

ذریعے یہ بتایا ہے کہ توجہ نہ دینے اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہونے کی وجہ سے سماج اور معاشرہ ہی نہیں' بلکہ خاندانوں میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

اردو کے خواتین ناولٹ نگاروں میں عصری حسیت اور شعر و ادب کے نکھار کے ساتھ موضوع اور تکنیک کو استعمال کرنے والی تخلیق کاروں میں جمیلہ ہاشمی کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے ناولٹ ''روہی'' اور ''یادوں کے الاؤ'' کے علاوہ ''داغ فراق'' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے ناولٹ ''روہی'' کے مرکزی کردار شیر دل یعنی بابا کا پوتا کے ذریعہ داخلی خود کلامی کو بیانیہ کی تکنیک سے پیش کیا ہے۔ یہ ناول سرحدی علاقے روہی کے نام کی نمائندگی کرتا ہے جہاں خوشحالی کی وجہ سے قحط کا سامنا کرنا پڑا اور لوگ نقل مکانی کر کے دوسرے علاقوں میں وہاں سے چلے جاتے اور پھر بارش کے موسم میں واپس آجاتے تھے۔ ناولٹ کے نسوانی کرداروں میں مریم کا کردار اہمیت کا حامل ہے' جو روہی جیسے مقام پر اپنے والد نور خاں کے ساتھ رہتی ہے' بلند خان کے بیٹے عیسیٰ خان سے اس کی شادی ہوجاتی ہے جو ایک سپاہی ہے' سرحد پر دشمنوں کے حملے سے وہ زخمی ہوکر انتقال کر جاتا ہے۔ اس پورے پس منظر میں یہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ عیسیٰ خان کے انتقال کی وجہ سے مریم کا رشتہ شیر دل کے بھائی امرایا خان سے جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مریم اس رشتہ کو قبول نہیں کرتی اور بابا کی خیالی رو پر اس ناولٹ کا اختتام عمل میں آتا ہے۔ ناولٹ میں فطری مناظر اور موضوع کے علاوہ طرز اظہار کی وارفتگی پائی جاتی ہے۔ اس کا دوسرا ناولٹ ''یادوں کے الاؤ'' کا مرکزی کردار دلدار سنگھ ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اس ناولٹ میں سکھ گھرانے کی ماضی کے واقعات کو دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناولٹ کا مرکزی کردار دلدار سنگھ خود کلامی کے پیرائے میں اپنے روداد پیش کرتا ہے' جس میں بچپن کے حالات اور بہن کی زندگی کے علاوہ دادی کے کہانی سنانے کے منظر کو پیش کیا گیا ہے اور دلدار سنگھ کے بچپن اور جوانی کے واقعات پر ناولٹ ختم ہوتا ہے۔ اتم سنگھ کو دلدار سنگھ کا باپ بتایا گیا ہے۔ دلدار سنگھ کے بھاگو سے تعلقات تھے اور بھاگو اپنے باپ انوپ سنگھ کا قتل کرتا ہے' جس کی وجہ سے اتم سنگھ کو سزائے موت ہوجاتی ہے۔ غرض اس ناول میں ایک شخص کی گھریلو ذمہ داریاں اور معاشرتی زندگی کے علاوہ طیش میں آکر کرنے والے جرائم کی بھی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے اس ناولٹ میں سکھوں کی زندگی اور ان کے رہن سہن ہی نہیں' بلکہ ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیوں کو نمایاں کیا ہے۔ تکنیک اور پیشکش کے اعتبار سے ان کا یہ ناولٹ قاری کو متاثر کرتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا ایک اور ناولٹ ''داغ فراق'' ہے جو سکھ خاندان کے دو بھائیوں کی کہانی پر مشتمل ہے۔

دونوں کسان ہیں ناولٹ کا مرکزی کردار واحد متکلم کے انداز سے کہانی بیان کرتا ہے' جس کے مطابق بنی کے شوہر کے انتقال کے بعد یہ دونوں بھائی زراعت میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ واحد متکلم کی شادی ایک لڑکی جنداں سے ہوتی ہے۔ کہانی میں بنی کو مرکزی کردار اور اس کے بھائی چنتن کو ثانوی کردار کا درجہ دیا گیا ہے۔ غرض چنتن پر حملہ کرنے کی وجہ سے اس کا قتل ہوتا ہے اس واقعہ کے بیس سال بعد قاتل کا ضمیر ملامت کرتا ہے اور وہ اپنے اقرار جرم کے بعد اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا ہے۔ اس طرح جمیلہ ہاشمی اس ناولٹ کے ذریعے انسان کی فطری کمزوری اور برائی کرنے کے بعد اس کے ضمیر کے جھنجھوڑنے کی کیفیت کو اس ناولٹ کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس طرح اردو کے ناولٹ نگاروں میں خواتین کی حیثیت سے سب سے پہلے رضیہ سجاد ظہیر پھر اس کے بعد عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے بعد جیلانی بانو' آمنہ ابوالحسن اور شکیلہ اختر کے بعد جمیلہ ہاشمی جیسی تخلیق کار خواتین نے اردو نثر کو خواتین کے ناولٹ کی نمائندگی سے وابستہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ناولٹ نگاری کی تاریخ میں سب سے اہم مقام قرۃ العین حیدر کا قرار دیا جاتا ہے' جس کے بعد جیلانی بانو ایک ایسی تخلیق کارہ ہیں' جنھوں نے ناولٹ کے فن کو بھرپور نمائندگی کی' اس کے علاوہ دیگر خواتین نے بھی ناولٹ لکھ کر اس صنف کی آبیاری کی طرف توجہ دی۔ خواتین کے ناولٹ اپنی جگہ مسلمہ اور ان کی اس صنف کی نمائندگی میں پیشکش کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خواتین ناولٹ نگار اپنے فن کی نمائندگی میں پوری طرح کامیاب ہیں' لیکن اردو ناولٹ نگاری میں مرد حضرات کے مقابلے میں کسی بھی خاتون کا ناولٹ اس معیار کی نمائندگی نہیں کرتا کہ جس کی وجہ سے خواتین کے ناولٹ کو امتیازی مقام دیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والے دور میں اردو کی خواتین اعلیٰ سے اعلیٰ ناولٹ لکھ کر اس کمی کو پوری کرنے کی طرف متوجہ ہوجائیں۔ غرض خواتین کی تخلیق کاری سے توقع کی جاتی ہے کہ جس طرح ناول نگاری میں خواتین نے اپنی سبقت کا مظاہرہ کیا' اسی طرح آنے والے دور میں اردو خواتین کے ناولٹ بھی ادبی' فنی اور معیاری نوعیت کے حامل ہوجائیں گے۔

□□□

Humera Tasneem
Head Dept. of Urdu
Satavahana University
Malkapur Road, Chintakunta
Karimnagar-505002 (Telangana)

ڈاکٹر آمنہ تحسین

رضیہ سجاد ظہیر کی تخلیقات میں نسائی شعور

عالمی سطح پر نسائی شعور کے مطالعہ و تجزیہ کا رجحان بیسویں صدی کی اولین دہائیوں سے ہی بڑھنے لگا تھا۔لیکن 1960 کے دہے کی تانیثی تحریک یعنی ''ویمن لیبریشن موومنٹ'' کی ابتدا سے ہی تمام شعبہ ہائے حیات میں موجود نسائی فکر وشعور کی نشاندہی نیز مطالعہ و تحقیق میں اس طرزِ فکر کی شمولیت پر کافی زور دیا جانے لگا تاکہ پدر سری سماج میں عورت کے متعلق قائم کیے گئے مفروضات ونظریات نیز عورت کے مکمل وجود و طرزِ فکر کو سمجھا جا سکے۔ابتدا میں اگر چہ اس پر توجہ نہیں دی گئی تاہم بعد کے برسوں میں آہستہ آہستہ اس کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی اور نسائی فکر وشعور کی تلاش و تفہیم کو مختلف علوم کا حصہ بنایا جانے لگا۔ ادب کے حوالے سے بھی نسائی فکر وشعور کو سمجھنے کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔لہٰذا عصرِ حاضر میں جہاں مجموعی طور پر ادب کو تانیثی نقطہ نظر سے جانچنے پرکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے وہیں ''نسائی ادب'' کا مطالعہ و تجزیہ بھی اہمیت اختیار کرنے لگا ہے۔

گذرے برسوں میں نسائی ادب و تانیثیت کے حوالے سے انگریزی زبان میں کئی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ان ہی قلم کاروں میں مشہور تاریخ داں و قلم کار گرڈا لرنر نے اپنی کتاب The Creation of Feminist Consciousness (1993) اور ایلین شو والٹر نے اپنے مضمون Towrads a feminist poetics میں نسائی شعور کے متعلق تفصیل سے ذکر کیا ہے اور نسائی شعور کے مطالعہ کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ بالخصوص ایلین شو والٹر نے تنقید کے جدید طریقہ نقد کے دو اہم پہلوؤں یعنی تانیثی تنقید (Feminist Criticism) اور نسوانی تنقید (Gyno criticism) کی وضاحت بھی پیش کی ہے۔(1)

متذکرہ تحریروں کے مطالعہ سے مجموعی طور پر یہ وضاحت ہوتی ہے کہ تانیثی نقطہ نظر سے کسی ادب پارے کا تجزیہ کیا جائے تو نسوانی کرداروں کے حوالے سے پدر سری سماج کے نظریات اور عورت کے متعلق تصورات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی مرد غالب معاشرہ میں عورت کے متعلق جو تصورات ونظریات پائے جاتے ہیں ان کی توضیح وتشریح کی جاسکتی ہے۔وہیں نسائی ادب کے مطالعہ سے خود عورت کے متعلق خاتون قلم کاروں کے تصورات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک مرد کے تشکیل دیے گئے تصور سے الگ ہیں۔اس کے علاوہ تمام شعبہ ہائے حیات کے متعلق خواتین کی طرزِ فکر واحساس نیز ان کے تجربات کو بھی ہم جان سکتے ہیں۔مجموعی طور پر نجی وسماجی زندگی کے متعلق عورت کا احساس و نسائی شعور نہایت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔جس کو سمجھنا ناگزیر ہے۔

گذرے برسوں میں نسائی ادب کے حوالے سے خواتین کے تجربات واحساسات کے مطالعہ کے نتیجے میں سماج کا نیا منظر نامہ تشکیل پا رہا ہے اور زندگی کے نت نئے زاویے، فکر و شعور کے انوکھے رنگ نمایاں ہو رہے ہیں۔یہ مطالعات انسانی زندگی سے جڑے تمام شعبوں میں

خواتین کے ویژن کو واضح کر رہے ہیں۔ اردو میں بھی فی زمانہ اس جانب توجہ دی جانے لگی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے اس موضوع پر مدلل گفتگو کی ہے اور واضح کیا کہ نسائی شعور کو جاننے کے لیے خواتین کی لکھی تحریروں کا مطالعہ ناگزیر ہے تاکہ ان کے طرزِ احساس اور نقطۂ نظر کو سمجھا جا سکے۔ (2)

اس ضمن میں مرزا خلیل احمد بیگ نے ایلین شووالٹر کے حوالے سے نسائی ادب کے مطالعہ کے لیے نسوانی تنقید کی اہمیت پر زور دیا ہے ان کے خیال کے مطابق:

"خاتون ادیبوں کی تخلیقات کے مطالعہ سے ہم عورت کے اندرون میں جھانک سکتے ہیں اور اس کی ذہنی، جذباتی اور داخلی کیفیات، نیز نفسیاتی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ اور یہ جان سکتے ہیں کہ عورت حقیقتاً ہے کیا؟"

جبکہ شاہدہ حسن لکھتی ہیں کہ

"نسائی شعور کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ شعور و آگہی کے بغیر جو کچھ بھی لکھا جائے اس کا اپنے عہد اپنے سماج اور اپنے زمانے کی فکر سے کبھی کوئی تعلق نہیں بن پاتا۔ اس اعتبار سے نسائی شعور کے ارتقاء کا سراغ لگانا بھی ضروری ہے۔ خواتین لکھنے والیوں کے حوالے سے جو مطالعات مسلسل سامنے آ رہے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شعور نیا ہرگز نہیں ہے'۔۔۔۔۔۔تخلیقی اظہار کی سطح پر یہ شعور صدیوں پہلے سے ہی موجود نظر آتا ہے۔ مختلف زبان و ادب میں لکھنے والی خواتین نے اپنے اپنے عہد کے تناظر میں اس شعور کا اظہار کیا ہے۔" (3)

ہندوستان کے تناظر میں دیکھیں تو نسائی شعور کی تاریخ کا سراغ صدیوں پہلے سے ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کے تقاضوں اور رجحانات کے مطابق نسائی ادب وجود میں آتا رہا تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر صورتوں میں نسائی شعور بالکل غیر واضح رہا اور اپنی شناخت نہیں بنا پایا۔ لیکن انیسویں صدی میں سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے نتیجے میں خواتین کو جب مناسب ماحول ملنے لگا تب خواتین کا تخلیقی شعور بھی بالیدہ ہوتا گیا۔ ان کی تحریروں میں تجربات و احساسات کی ایک نئی دنیا منکشف ہونے لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ نسائی شعور اور بھی نکھرتا گیا اور اظہار کی سطح پر نمایاں ہوتا گیا۔ نسائی شعور کے ارتقاء کی کئی ایک واضح تصویریں خواتین کی تحریروں میں نت نئے تجربات و احساسات کے اظہار کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ لہٰذا پیشِ نظر مقالہ میں رضیہ سجاد ظہیر کی تحریروں کے حوالے سے نسائی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بیسویں صدی کی نمائندہ خاتون تخلیق کاروں میں رضیہ سجاد ظہیر ایک اہم نام ہے۔ جن کی تحریروں میں عصری حسیت کے ساتھ ساتھ نسائی شعور کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ اشتراکیت کے نظریات اور ترقی پسند تحریک سے رضیہ سجاد ظہیر کی گہری وابستگی رہی ہے۔ ان کی تخلیقات میں ترقی پسند نظریات کی کہیں واضح تو کہیں مبہم شکل نظر آتی ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر نے ناول، افسانے، خاکے، مختلف زبانوں کے ادب کے اردو میں تراجم اور ادبِ اطفال میں طبع آزمائی کی اور خاطر خواہ ادبی سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں، سرِ شام (1953)، کانٹے (1954)، نقوشِ زنداں (مرتبہ 1951)، سمن (1963) اللہ میگھ دے، افسانوں وخاکوں کا مجموعہ زرد گلاب (1981)، اردو افسانے (مرتبہ 1974)، اللہ دے بندہ لے (افسانوں وخاکوں کا مجموعہ، مرتب نور ظہیر 1984) قابلِ ذکر ہیں۔ مذکورہ تخلیقات کے مطالعہ سے رضیہ سجاد ظہیر کے نسائی شعور کی مختلف جہات کا بھرپور اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ شعور ان کی خود آگہی سے سفر کرتا ہوا ان کی سیاسی و سماجی بصیرت نیز سماج

میں عورت کے مقام و مرتبہ کے متعلق ان کی فکر کا احاطہ کرتا ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر شادی سے قبل رضیہ دلشاد کے نام سے لکھا کرتی تھیں۔ 1938 میں ان کی شادی ترقی پسند تحریک کے میر کارواں سجاد ظہیر کے ساتھ ہوئی رشتہ اذدواج میں بندھنے کے بعد رضیہ سجاد ظہیر کے نام سے لکھنے لگیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کی تخلیقی صلاحیتیں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر خوب پروان چڑھیں۔ ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں جہاں ایک طرف ادب میں حقیقت پسندی کا رجحان عام ہوا تو دوسری طرف طبقاتی کشمکش کے پس منظر میں حاشیائی افراد کے مسائل بھی ادب کا حصہ بننے لگے وہیں اس تحریک کے تحت صنفی مساوات (Gender equality) کو عام کرنے، کام کی صنفی تقسیم (Gender division of labour) نیز خواتین کے کام کو غیر پیداواری کام (Un productive work) قرار دینے کے تصورات کو ختم کرنے جیسے موضوعات پر مباحثہ کو خوب فروغ حاصل ہوا جس کے نتیجے میں سماج میں خواتین کے حقوق و مرتبہ کے متعلق بیداری پیدا ہونے لگی نیز ادب میں بھی عام خواتین کے مسائل پیش کیے جانے لگے۔

چونکہ رضیہ سجاد ظہیر اشتراکی نظریات سے متاثر تھیں اسی لیے اپنی بیشتر تحریروں کی بنیاد ان ہی نظریات پر رکھی ہیں۔ ان کے ناول ہوں یا افسانے معاشرتی مسائل، عوامی زندگی، بدلتی ہندوستانی تہذیب کے علاوہ طبقاتی و انفرادی کشمکش اور عورت کے مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں اور طبقاتی کشمکش پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے محنت کے اشتراکی نظریہ اور صنفی مساوات کو عام کرنے کی بھر پور کوشش کی۔ طبقہ امراء بالخصوص بیگمات کی زندگیوں و فطرتوں پر طنز کرنے میں ان کا قلم خوب روانی سے چلتا ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کا مواد اگر چہ جیتی جاگتی زندگیوں اور سماج میں بکھری حقیقتوں سے حاصل کیا ہے لیکن ان کی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر وخیال کا مرکز ''عورت کا وجود'' ہے۔ ان کی بیشتر تخلیقات میں نسوانی کرداروں کو مرکزیت حاصل ہے۔ انھوں نے اعلیٰ و ادنیٰ طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کے علاوہ طوائفوں کی ظاہری و باطنی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو مکمل جزئیات کے ساتھ کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وہ ایک عہد کی متحرک تصویر بن گئی ہے۔ جس کے حوالے سے ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت اور سماج کے فرسودہ تصورات کے علاوہ بدلتے اقدار و نظریات کو بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر کا شمار ان چنندہ خواتین قلم کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے مسلسل متوسط طبقہ کی خواتین یا حاشیائی خواتین کی جدوجہد بھری زندگی اور ان کے گھریلو، سیاسی و سماجی مسائل اور ان کی جذباتی و نفسیاتی کشمکش کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے۔

رضیہ سجاد ظہیر نے ہندوستان کے دونوں دور دیکھے۔ ایک آزادی سے قبل کا وہ دور جو ہندوستان کی سیاسی و تہذیبی زندگی کا ایک انقلاب انگیز دور تھا۔ ایک طرف انگریزوں کی سازشیں تو دوسری طرف ان کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ عرصہ سے چلے آ رہے جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنے کی امنگیں۔ اس دور میں دانشور طبقہ نئے تصورات کے ساتھ ملک و سماج کے مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔ جس میں ادیب و شاعر پیش پیش تھے اسی دور میں رضیہ سجاد نے بھی قلم اٹھایا اور اپنا ادبی سفر شروع کیا۔ دوسرا دور ملک کی آزادی کے بعد کا دور، جس میں بدلتے حالات، افراد کی سماجی و معاشرتی زندگی کی جدوجہد، نئے نئے مسائل، ترقی و خوشحالی کی کوششوں پر زور دیا جا رہا تھا۔ رضیہ سجاد نے اگر چہ کہ ملک کی آزادی سے قبل مضامین و افسانوں کی شروعات کی تھی لیکن ان کی بیش تر تحریریں ملک کی آزادی کے بعد منظر عام پر آئیں۔ لہٰذا ان کی تحریروں میں اس دور کے وہ تمام حالات کو دیکھا جا سکتا ہے جو ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کا حصہ بن رہے تھے۔ بالخصوص اس دور میں مختلف یونینوں کا قیام، سماجی مسائل پر جلسے، جلوس، میلا سنگھٹوں، سیاسی تحریکیں، الیکشن، سماجی فلاح و بہبود کے پروگرامس کی تشہیر و عمل آوری کافی زوروں پر تھی۔ مذکورہ موضوعات کے علاوہ خواتین کے مسائل نیز ان کی بدلتی شبیہ کو رضیہ سجاد ظہیر کی کئی ایک تخلیقات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں مرکزیت نسوانی کرداروں کو حاصل ہے جو باشعور ہیں فعال و فیصلہ ساز ہیں۔ زندگی کی تمام تر جدو جہد میں مرد کے شانہ بہ شانہ حصے دار ہیں۔

ان کے نسائی شعور کو سمجھنے کے لیے پہلے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور ان کی ذہنی و فکری نشو نما کو سمجھنا بھی ناگزیر لگتا ہے۔ کیونکہ شعور کا راست تعلق فرد کی سوچ و فکر، اس کے خاندان، سماج اور ماحول سے ہوتا ہے۔ رضیہ سجاد کو ورثہ میں علم پرور گھرانہ ملا تھا۔ ان کے والد شعبہ تعلیمات سے جڑے تھے۔ انھوں نے رضیہ کی تعلیم پر بھر پور توجہ دی جس کے نتیجے میں وہ بآسانی گریجویشن کر پائیں۔ تعلیم اور گھر کے روشن خیال افراد کے درمیان ان کی شخصیت خوب نکھری۔ وہ باشعور، حوصلہ مند و پرعزم شخصیت کی مالک تھیں۔ اگر چہ کہ شادی سے قبل ان کی زندگی عام لڑکیوں کی طرح پرسکون تھی۔ لیکن 1938 میں سجاد ظہیر سے شادی کے

بعد سے ان کی زندگی ایک جہدِ مسلسل سے تعبیر ہوگئی۔ باوجود اس کے وہ ایک بلند حوصلہ جہد کار کی طرح زندگی کے محاذ پر آخر وقت تک ڈٹی رہیں ۔شادی کے تقریباً ایک برس بعد یعنی 1939 میں حکومتِ وقت کی جانب سے سجاد ظہیر کی گرفتاری کے ساتھ ہی مشکل راہوں پر ان کے سفر کی شروعات ہوگئی۔ سجاد ظہیر لکھنو جیل میں دو سال تک قید رہے۔ اس دوران انھوں نے رضیہ سجاد کو جو خطوط لکھے ان کے مطالعہ سے رضیہ سجاد کی زندگی کے مصائب کے ساتھ ساتھ ان کی جد وجہد کو بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے ۔سجاد ظہیر کی محبت سے بھرے ان خطوط کو رضیہ نے ''نقوشِ زنداں'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ نقوشِ زنداں کے متعلق عصمت چغتائی نے لکھا تھا۔

''شاید رضیہ نے ان ہی خطوط کے سہارے زندگی کی تلخیوں کو
اس خوبصورتی سے جھیلا'' (4)

سجاد ظہیر دو برس بعد جیل سے رہا ہو گئے لیکن ہندوستان و بیرونِ ہند میں اشتراکیت کے نظریات کو عام کرنے اور سماج سے جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ نیز طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے اور ملک کو انگریزوں سے آزاد کروانے کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا وقفہ سفر میں ہی گذارا۔ نہ صرف آزادی سے قبل بلکہ آزادی وتقسیمِ ہند کے بعد پاکستان میں اشتراکیت کے نظریات کو عام کرنے کے لیے بھی سفر کیا۔ چند برسوں بعد وہاں گرفتار کر لیے گئے اور جیل میں مقید کر دیے گئے۔ وہاں سے رہائی کے بعد ہندوستان واپس آئے لیکن ان کی جدوجہد اور مختلف ممالک کا سفر تادمِ آخر یعنی 1973 تک چلتا ہی رہا۔ اس تمام عرصہ میں رضیہ سجاد اپنے شوہر سجاد ظہیر کے قدم بہ قدم ساتھ رہیں۔ قدرت نے انھیں چار لڑکیوں سے نوازا۔ سجاد ظہیر کی غیر موجودگی میں بیٹیوں کی تعلیم و پرورش کی ذمہ داری تنہا نبھائی۔ اس اہم ذمہ داری کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی گریجویشن کی تعلیم کو آگے بڑھاتے ہوئے الہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے کیا اور پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوگئیں۔ اس دوران خود انھیں اپنے بچوں کے ساتھ مختلف شہروں میں قیام کرنا پڑا۔ باوجود ان تمام صعوبتوں کے رضیہ نے سجاد ظہیر کا ساتھ نہیں چھوڑا اور نہ اشتراکیت و ترقی پسند تحریک کے فروغ کے کاز میں کبھی پیچھے رہیں۔ سجاد ظہیر کی تحریر کردہ کتاب ''روشنائی'' کے صفحات پر بکھرے رضیہ کے ذکر سے بھر پور اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رضیہ ایک باشعور وفعال شخصیت کی حیثیت سے کس طرح سجاد ظہیر کے ساتھ قدم بہ قدم چلتی رہیں۔ اپنی زندگی کے متعلق وہ خود کیا لکھتی ہیں ملاحظہ کیجیے

''ہماری آدھی سے زیادہ مشترکہ زندگی الگ الگ رہ کر خطوں پر بسر ہوئی۔ پھر بھی ہمیں ایک ایسی رفاقت نصیب رہی جو بہت کم میاں بیوی کو ملتی ہے۔۔۔۔۔۔ اگر شعور اور احساس کو سوشلیزم لانے کے لیے بروئے کار لانا ہوگا تو ذاتیات کو پس پشت ڈالنا ہوگا۔'' (5)

درجہ بالا اقتباس سے رضیہ سجاد کے شعور کی پختگی اور زندگی کے لیے طے شدہ لائحۂ عمل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سجاد ظہیر کے ساتھ وہ نہ صرف سیاسی وسماجی تحریک کی شریکِ کار رہیں بلکہ انھوں نے اپنا ادبی سفر بھی مسلسل جاری رکھا۔ یوں تو گاہے بگاہے ان کے مضامین و افسانے شائع ہوا کرتے تھے لیکن 1950 کے بعد سے ان کی کتابیں منظرِ عام پر آنے لگیں۔ کسی خاتون کا تمام تر نامساعد حالات میں یوں تناور درخت کی طرح مضبوط ارادوں کے ساتھ کھڑا رہنا اس شخصیت کی زبردست قوتِ ارادی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی صاحبزادی نور ظہیر کا تحریر کردہ ایک واقعہ کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا جس سے ہم رضیہ سجاد کی پوری زندگی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ان کی خود آگہی وخود شناسی کو محسوس کر سکتے ہیں نیز ان کی زندگی میں تخلیقی سفر کی اہمیت کا اندازہ بھی

لگا سکتے ہیں۔نور ظہیر لکھتی ہیں کہ جب وہ ملاقات کے لیے آئیں تو اماں کچھ لکھنے میں مصروف تھیں انھوں نے نور ظہیر کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ وہ ناراض ہوکر جانے لگیں تب رضیہ سجاد نے آواز دی اور کیا کہا ملاحظہ کیجیے:

''ٹھہرو بیٹی جارہی ہو تو جاؤ لیکن ایک بات سنتی جاؤ اگر ہم اپنے کام کے بارے میں خودغرض نہ ہوتے تو یہ نوکری، یہ زندگی بھر کی جدو جہد، تمہارے ابا کے جیل کا سفر، تم لوگوں کی پڑھائی لکھائی ہمیں ایسا مارتی کہ ہم کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ ہماری قوت ارادی ہماری طاقت ہے۔ ہمارا لکھنا ہمیں زندہ رکھتا ہے۔کیا ہمیں زندگی کے بارے میں خود غرض ہونے کا بھی حق نہیں'' (6)

مذکورہ سطور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رضیہ سجاد کس قدر قوت ارادی کی مالک تھیں۔ وہ اس کائنات میں عورت کے وجود کی اہمیت، اس کی صلاحیتوں اور اس کے فعال کردار سے پوری طرح واقف تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود بھی اپنے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچان پائیں اور اپنی شخصیت کو مکمل کر پائیں۔ انھیں اپنی صلاحیتوں پر بھی پورا اعتماد تھا۔یہی اعتماد انھیں زندگی کی مشکل راہوں پر چلنے کے لیے حوصلہ بخشتا رہا۔ان کی تحریروں کے مطالعہ سے عورت کے وجود کے متعلق ان کے نظریات سے آگاہی ہوتی ہے۔وہ عورت کے وجود کو اس کائنات کا مرکز اور بڑی طاقت مانتی ہیں۔ذیل کی سطور ملاحظہ کیجیے:

''عورت کائنات کا سب سے دل کش معمہ ہے۔دونوں عالم کی سب سے بڑی طاقت، محبت کی امانت دار، نسل انسانی کے قیام کی ذمہ دار، اور حیاتِ انسانی کی رازدار'' (7)

رضیہ سجاد کی نظر میں عورت اس کائنات کی تکمیل کا سرچشمہ بھی ہے۔اس کی محبت ہی حیاتِ انسانی میں تسلسل قائم رکھتی ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتی ہیں

''آپ کے خیال میں حیات کس وقت مسکراتی ہے؟
-----جب محبت کے لمحے زندگی کا روپ بھرتے ہیں،
جب عورت گود میں اپنے چاہنے والے کی تصویر دیکھتی ہے۔جب پلو کی آڑ میں حیات کا خون ایک اور حیات کو سینچتا ہے۔جب دو ننھے منے، چمکتے ہیرے عورت کے محبوب کی آنکھوں کا نور لے کر اس کے دامن سے جھانکتے ہیں۔حیات میں تسلسل قائم ہوتا ہے۔ زندگی کی زنجیر میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہوتا ہے'' (8)

عورت کا اپنے وجود کی اہمیت کے متعلق یہ احساس وشعور رضیہ سجاد کے تقریباً تمام نسوانی کرداروں میں جھلکتا ہے خواہ کردار سماج کے کسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں لیکن وہ اپنا ایک مکمل وجود رکھتے ہیں جو اپنی سوچ وفکر اور عمل میں آزاد ہیں اور بہ حیثیت ایک باشعور فرد کے سماج میں اپنا مقام جانتے ہیں۔وہ نسوانی کردار پدرسری معاشرہ کا حصہ ہونے کے باوجود کسی کے محکوم نہیں رہتے بلکہ اپنے موقف کی بحالی اور حقوق کے حصول کے لیے مزاحمت پر ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ایسے باشعور، بااختیار وفیصلہ ساز نسوانی کرداروں کی چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ناول اللہ میگھ دے کے مرکزی کردار دیپا کے یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے:

''دیپا۔ میں کیا کٹھ پتلی ہوں جو تم کہوگے میں وہی کروں گی'' (9)

ناول سمن کی ہیروئن ''سمن'' جو ایک طوائف کی بیٹی ہے لیکن اس پیشہ اور عیش وآرام کو چھوڑ کر محنت ومزدوری کے ساتھ زندگی گذارنے کو ترجیح دیتی ہے۔اس کی خودشناسی کا انداز دیکھیے:

''وہ کسی کو اپنے ساتھ کھیلنے نہیں دے گی۔کیا وہ کوئی مٹی کا کھلونا ہے'' (10)

افسانہ 'دو دل ایک داستان' کے نسوانی کردار کا یہ روپ دیکھیے:

''میں دنیا والوں کا یہ حق تسلیم ہی نہیں کرتی کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھیں'' (11)

رضیہ سجاد کے نسوانی کردار نہ صرف فکری سطح پر خودشناس ہیں بلکہ عملی میدان میں بھی اپنے وجود کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں وناولوں میں سماج کے مختلف طبقات ومختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے نسوانی کردار پیش کیے گئے ہیں۔وہ کردار نامساعد حالات کے پیدا کردہ ایسے کردار نہیں ہیں جو حالات سے سمجھوتا کرنے پر آمادہ رہتے ہیں بلکہ تقریباً تمام نسوانی کردار خوداعتمادی کی دولت سے مالامال ہیں وہ حالات کے آگے نہ شکست کھاتے ہیں اور نہ مجبور ہوکر خود کو حالات کے سپرد کرتے ہیں بلکہ ایک باشعور وفیصلہ ساز فرد کی حیثیت سے اپنے راستے خود ہموار کرتے ہیں۔

رضیہ سجاد نے ہندوستانی خواتین کے مختلف مسائل کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا اور مرد غالب معاشرہ میں ان کی حیثیت پر کھل کر لکھا۔ بالخصوص جاگیردارانہ نظام کی روایتوں پر بھرپور طنز کیا ہے۔ناول سمن

سے طوائف کی زبانی یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے جس میں جاگیردارانہ نظام اور عورت کی حیثیت کی تصویر صاف دکھائی دیتی ہے:

"ایک تو وہ سید صاحب تھے جن کو اس کی امی کہتی تھیں یہ تیرے باپ ہیں۔ان سید صاحب کے گھر میں بیوی تھیں، لڑکے لڑکیاں تھیں۔ایک بہو اور داماد بھی تھے اور تین ان کے بچے بھی تھے۔پھر انھوں نے دنیا میں سمن کو بھی کیوں پیدا کردیا۔اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔۔۔۔۔۔سمن کو ان سے سخت نفرت تھی۔(12)

ہندوستان کی آزادی کے بعد ملک میں مختلف قسم کے حالات پیدا ہوئے۔ایک طرف مجموعی طور پر ترقی کے اقدامات اپنائے جانے لگے تو دوسری طرف خواتین کی فلاح وبہبود پر توجہ مرکوز کی گئی۔ لہٰذا مسائل سے دوچار، مجبور وبے کس خواتین کی فلاح وبہبود کے کام شروع کیے گئے۔طوائف بازاری ختم کرنے کی کوششیں شروع کی گئیں۔بے آسرا اور مجبور خواتین کے لیے آشرم بنائے گئے۔لیکن دوسری طرف ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ اسی ماحول میں ان پریشان حال عورتوں کا استحصال کرنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی جس میں سیاست دانوں سے لے کر عام افراد شامل تھے۔ان حالات کا رضیہ سجاد نے بڑے قریب سے مشاہدہ کیا اور اسے اپنے ناول "سمن" میں بڑے موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔اس ناول میں سماج کی پست ذہنیت کو کس طرح سے پیش کیا ہے ملاحظہ کیجیے:

"ارے بھائی، اکیلے آدمی ہیں گھر میں کیا جی لگے گا یہاں ہی بیٹھے رہتے ہیں" دوسرے نے جواب دیا "ہاں آشرم میں تو پھر بھی کچھ دیکھنے کو مل جاتا ہوگا۔"

پہلے نے ہنس کر کہا "ارے صرف دیکھنے کو تھوڑا ہی برتنے کو بھی" دوسرے نے اور زور سے ہنس کر کہا پھر دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔(13)

رضیہ سجاد نے سماج میں عورت کی پست حیثیت، محکومیت، صنفی عدم مساوات اور کام کی صنفی تقسیم جیسے اہم موضوعات کو اپنی تحریروں میں موضوع بحث بنایا اور مختلف واقعات و مکالموں کے ذریعہ گویا سماج کی توجہ ان مسائل پر مرکوز کروائی۔ جیسے ناول "سمن" سے یہ اقتباس دیکھیے۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی بات کو صحیح نہیں سمجھتی ہوں۔یوسف صاحب۔مرد پیسے دیتے ہیں تو کیا عورتیں کام نہیں کرتیں۔مفت دیتے ہیں؟ دو بچوں کی ہی نگرانی کھانے کپڑے کے عوض بہت سستی ہے۔۔۔۔اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے ہیں۔دعویٰ ہے کہ ہمارے نظام میں مرد عورت برابر ہوں گے۔۔۔۔عورت کی برابری کا دعوہ کرنے والے کمیونسٹ کے گھر میں میں نے دیکھا کہ بیوی پلنگ اٹھا رہی ہے۔جھاڑو دے رہی ہے۔ چائے لاکر ان کے سامنے رکھ رہی ہے اور ان کے جوتوں پر پالش کر رہی ہے۔اور وہ لیڈر بنے کرسی پر اخبار لیے بیٹھے ہیں۔"(14)

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"وہ تو اس اصول کی حیثیت سے یہ مان چکی تھی کہ اس سماج کی شادی "قانونی طوائفیت" تھی اور کچھ نہیں۔"(15)

رضیہ سجاد کی تحریروں میں سماج کے صنفی نظریات و روایات سے انحراف کی کئی ایک واضح جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان کے ناول "اللہ میگھ دے" میں بھی اس طرح کی کوشش کو دیکھا جا سکتا ہے۔اس ناول میں پانی کے ڈیم کی تعمیر کو موضوع بنایا گیا ہے۔گاؤں میں ڈیم کے قیام کی ضرورت کے متعلق تعلیم یافتہ نوجوان نسل کے ذریعہ پوری ایک تحریک چلائی گئی۔جس میں لڑکے اور لڑکیوں نے حصہ لیا۔تاہم جب ڈیم بن کر تیار ہوگیا تو اس کی کامیابی کا سہرا گاؤں کے نوجوان انجینیروں کو دیا گیا۔اس تحریک میں شامل یا ان کوششوں کے پیچھے چھپی خواتین کی حصہ داریوں کو بالکل فراموش کردیا گیا۔جیسا کہ سماج میں ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ خواتین کے کام کو کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان کے کام کو غیر پیداواری کام قرار دیا جاتا ہے۔صدیوں سے چلے آرہے اس روایتی تصور کو رضیہ سجاد نے بدلنے کی کوشش کی۔جیسا کہ ناول "اللہ میگھ دے" میں اس اہم موضوع کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ناول کی ہیروئن تعلیم یافتہ و باشعور ہے۔جب ناول کا ہیرو جو ڈیم کی تعمیر کرواتا ہے، اپنی اس کامیابی پر فخر کا اظہار کرتا ہے تو وہ چپ نہیں رہتی بلکہ ہیرو کے خیالات سے انحراف کرتی ہے اور اسے خواتین کی حصہ داری کے متعلق اچھی طرح سے احساس دلاتی ہے۔گویا صنفی مساوات کے متعلق اپنا احتجاج درج کرواتی ہے۔ذیل کے اقتباس میں دو کرداروں کی زبانی یہ مکالمے ملاحظہ کیجیے:

"جو چیز آج حقیقت بن گئی ہے یہ کبھی لوگوں کا خواب تھی" لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔اور ان خوابوں کو ہم انجینیروں نے پورا کیا۔"

لڑکی مسکرائی نہیں سنجیدہ رہی۔تھوڑی دیر بعد کہا

نسیم سعید

فن اور ہندوستانی خواتین

ہندوستانی سماج میں ہمیشہ سے ہی مردوں کی اجارہ داری رہی ہے۔خواتین کا کسی نہ کسی صورت میں استحصال ہوتا رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی معاشرہ ہمیشہ پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ رہا ہے۔ پھر چاہے مردوزن کے موازنے کے لیے تعلیم کا شعبہ رہا ہو یا سیاست کا، معاشی شعبہ رہا ہو یا پھر ثقافت کا۔ چند دہائی قبل تک فنونِ لطیفہ کے شعبے میں تو خواتین کا قدم رکھنا ہی محال تھا۔مگر ہندوستانی خواتین نے ہمیشہ سے فن کے شعبے سے کسی نہ کسی صورت اور طرز میں اپنے آپ کو اس سے مربوط رکھا۔درس و ترغیب کے ذریعے سے یا پھر تحفظ کو یکجا کرنے والی سمت کی شکل میں یا پھر فنی شخصیت کی جدید صورت میں تخلیق کار اور نئی راہ کی تلاش میں۔ آج ہندوستانی خواتین نے تاریخ نویسی اور تنقید نگاری کے شعبے میں بھی اپنے پیر مضبوط جما کر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کا حوصلہ پالیا ہے۔

آج کے اس تغیر پذیر دور میں زندگی کے ہر شعبے میں خصوصاً فن اور اُس کی دیگر صورتوں کی ترقی اور تزئین وآرائش سے مربوط موڑ پر تاریخی اعتبار سے خواتین ایک مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔ یہ حقیقت اس وقت اور بھی دلچسپ اور پُر لطف ہو جاتی ہے جب فنونِ لطیفہ کے حالیہ نظام کے سماجی حوالے سے بات سامنے آتی ہے جو کہ روایتی صورت سے مردوں پر مرکوز شعبہ رہا ہے۔ جہاں مردوں نے اس شعبے میں کبھی بھی خواتین کو کسی بھی دھارا میں شامل ہونے کا موقع نہیں عطا کیا۔اس کے باوجود ہندوستانی معاصر آرٹ نے بہت سی خواتین فنکاروں کو اُبھرتے ہوئے دیکھا ہے۔

خواتین نے اس شعبے میں کئی بے مثل اور بے نظیر کام انجام دیے۔ جس میں حالیہ صورت میں وسیع وعریض مدعوں کو خطاب کرنا شامل ہے۔ان میں ماحولیات کی تباہی، سماجی ناانصافی، شہروں میں خواتین کا تحفظ اور غیر یقینی وجود شامل ہیں۔ ہندوستان کی خواتین فنکاروں کے کام کو جوڑنے والا سب سے مضبوط عنوان ہے خود کی قابل قدر شکل سے اظہارِ خیالات کرنے کے لیے اُن کے اداروں کا عکس۔ آج بھی ایک خاتون کے لیے فن کو بطور ذریعہ معاش منتخب کرنا غیر روایتی پیشہ ہے۔ لیکن 1920 یا 1930 کی دہائی میں ایسا کرنے کے لیے مضبوط ارادوں اور مخالف حالات سے ٹکرانے کے حوصلے کی ضرورت تھی۔ یہاں تک کہ باغیانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت بھی پڑتی تھی۔ یہ میرا یقین ہے کہ اگر سماجی باہمی مناسب، موافقت اور تماثل کی لکیروں کو توڑنے کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی تو ممکن تھا کہ آج بھی خواتین یا تو دیوی یا پھر ماں کی کالے اور سفید رنگوں کی تصویروں میں خود کو منقش کر رہی ہوتیں۔

صدیوں پرانی مردوں کی عمل داری اور تسلسل والی اس روایت کو اگر پہلی بار کسی نے توڑا تو اس کا سہرا امرتا شیر گل کو جاتا ہے۔ شیر گل کی تصویروں میں پہلی بار عنوان کے طور پر عام ہندوستانی عورت اپنے وجود کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔انھیں بیسویں صدی کی شروعات کے فن کے شعبے میں بطور خاتون فنکار اور جدید ہندوستانی فن کا رہبر تسلیم کیا جاتا ہے۔ جہاں شیر گل کی پینٹنگ آج ہندوستانی فنکاروں کے ذریعے بنائی گئی

سب سے مہنگی تصویروں میں سے ہیں، وہیں ان کی حیات میں اُن کے کام کو مناسب مقام اور تعریف کے دو بول کبھی حاصل نہیں ہوئے۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کی شروعات میں شعبہ فن سے تعلق رکھنے والی عظیم خاتون امرتا شیرگل کو خراج عقیدت دیتے ہوئے ایک نمائش کا اہتمام بھی حال ہی میں کیا گیا تھا۔ صرف چودہ سال کی عمر میں امرتا شیرگل نے اپنے خیالوں

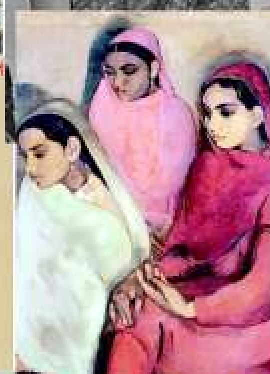

اور شاعرانہ غور و فکر پر محو ہو کر پنسل سے Self painting کی ایک Series بنائی۔ 28 سال میں ان کی اچانک موت سے عالم فن مصوری کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنی تصاویر کے توسط سے خاتون فنکاروں کی ایک نئی نسل کو راستہ ضرور دکھا دیا تھا۔ امرتا شیرگل سے سبق لیتے ہوئے نسرین محمدی، نلینی مالینی اور ارپتا سنگھ سمیت کئی خاتون فنکاروں کی اگلی نسلوں نے مرد فنکاروں کے ساتھ برابری کا سلوک نہ ہونے کے باوجود اپنے فن کے توسط سے اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کی مسلسل کوشش کی۔ ان خواتین کی فنی سرگرمیوں کو مردانہ نقاد کے مقابلے بھلے ہی امید سے کم اہمیت اور دام ملے۔ انہیں عالمی سطح کی اہمیت کی حامل عظیم نمائش گاہوں اور کسی بھی مشہور و معروف فنکار کے ذریعے شروع کیے گئے گروپ جیسے 1890 Progressive Artist group سے باہر رکھا گیا۔ لیکن آج ان فنکاروں نے بھی اپنی جانب ان لوگوں کی توجہ مرکوز کی ہے۔ ساتھ ہی مشکل اور عسیر الفہم اختلافی و تضادی فنکارانہ روایتوں کو سامنے لانے والے اُن کے کام سے جدید ہندوستانی فن کے گرد و پیش کے مناظر کو پھر سے واضح کیا گیا ہے اور نئی اصطلاح سے متعارف کرایا گیا۔ ان خاتون فنکاروں کو ایک عظیم اسٹیج KNMA نامی ادارے نے ماضی سے متعلق فن کے حالات کو ظاہر کرنے کے لیے نمائش کا اہتمام کیا جس سے قومی اور بین الاقوامی کشش کا مرکز یہ خواتین فن کار بنیں۔ اُن کے کام کی طرف لوگوں کی توجہ مرکوز ہوئی۔ نسرین محمدی کی 2016 میں Metropolitan Museum of Art Bureau نیویارک اور 2015 میں رینا صوفیہ میوزیم (Reina sofia Museum) اور نلینی مالینی کی حال ہی میں پیرس میں The Centre Pompidou میں ہندوستانی فن پر عالمی توجہ مرکوز کرنے والے نمائش گاہوں میں KNMA نے تعاون کیا ہے۔ بھارتی کھیر، شیبا چھچھی، توجوت الطاف، متھو سین، شیلو شیو سلیمان اور سونیا کھرانہ جیسی نئی نسل کی خاتون فنکار بھی ہندوستان اور بین الاقوامی سطح پر عالمی نمائش گاہوں اور نیلامی گھروں کے حوالوں سے اپنا مقام بنانے میں کامیاب رہی ہیں۔ اُن کے آرٹ کے کاموں کی قیمت پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور اُن کے آرٹ کے تئیں لگاؤ اور دلچسپی نے ہندوستانی جدید و معاصر آرٹ کو اور زیادہ مضبوط بنایا ہے۔ ان قابل ذکر خواتین نے آرٹ کو نہ صرف فن کے لیے بلکہ اس سے Self Transformation tool کی شکل میں مدافعتی اور مخالفتی صورت میں اپنا کر اسے اپنی ان کہی کہانیوں کو بتانے کے لیے استعمال کیا ہے۔

❑❑❑

Naseem Sayeed
M.M. Rabbani High School
Kamptee-441001 (Maharashtra)

سب سے مہنگی تصویروں میں سے ہیں، وہیں ان کی حیات میں اُن کے کام کو مناسب مقام اور تعریف کے دو بول کبھی حاصل نہیں ہوئے۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کی شروعات میں شعبۂ فن سے تعلق رکھنے والی عظیم خاتون امرتا شیر گل کو خراج عقیدت دیتے ہوئے ایک نمائش کا اہتمام بھی حال ہی میں کیا گیا تھا۔ صرف چودہ سال کی عمر میں امرتا شیر گل نے اپنے خیالوں

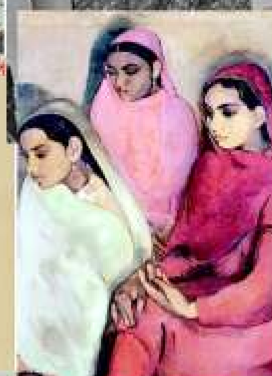

اور شاعرانہ غور وفکر پر محو ہو کر پنسل سے Self painting کی ایک Series بنائی۔ 28 سال میں ان کی اچانک موت سے عالم فن مصوری کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنی تصاویر کے توسط سے خاتون فنکاروں کی ایک نئی نسل کو راستہ ضرور دکھا دیا تھا۔ امرتا شیر گل سے سبق لیتے ہوئے نسرین محمدی، نلینی مالینی اور ارپنا سنگھ سمیت کئی خاتون فنکاروں کی اگلی نسلوں نے مرد فنکاروں کے ساتھ برابری کا سلوک نہ ہونے کے باوجود اپنے فن کے توسط سے اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کی مسلسل کوشش کی۔ ان خواتین کی فنی سرگرمیوں کو مردانہ نقاد کے مقابلے بھلے ہی امید سے

کم اہمیت اور دام ملے۔ انہیں عالمی سطح کی اہمیت کی حامل عظیم نمائش گاہوں اور کسی بھی مشہور و معروف فنکار کے ذریعے شروع کیے گئے گروپ جیسے 1890 Progressive Artist group سے باہر رکھا گیا۔ لیکن آج ان فنکاروں نے بھی اپنی جانب ان لوگوں کی توجہ مرکوز کی ہے۔ ساتھ ہی مشکل اور عسیر الفہم اختلافی و تضادی فنکارانہ روایتوں کو سامنے لانے والے اُن کے کام سے جدید ہندوستانی فن کے گرد و پیش کے مناظر کو پھر سے واضح کیا گیا ہے اور نئی اصطلاح سے متعارف کرایا گیا۔ ان خاتون فنکاروں کو ایک عظیم اسٹیج KNMA نامی ادارے نے ماضی سے متعلق فن کے حالات کو ظاہر کرنے کے لیے نمائش کا اہتمام کیا جس سے قومی اور بین الاقوامی کشش کا مرکز یہ خواتین فن کار بنیں۔ اُن کے کام کی طرف لوگوں کی توجہ مرکوز ہوئی۔ نسرین محمدی کی 2016 میں Metropolitan Museum of Art Bureau نیویارک اور 2015 میں رنیا صوفیہ میوزیم (Reina sofia Museum) اور نلینی مالینی کی حال ہی میں پیرس میں The Centre Pompidou میں ہندوستانی فن پر عالمی توجہ مرکوز کرنے والے نمائش گاہوں میں KNMA نے تعاون کیا ہے۔ بھارتی کھیر، شیبا چھچھی، توجوت الطاف، مٹھو سین، شیلو شیو سلیمان اور سونیا کھرانہ جیسی نئی نسل کی خاتون فنکار بھی ہندوستان اور بین الاقوامی سطح پر عالمی نمائش گاہوں اور نیلامی گھروں کے حوالوں سے اپنا مقام بنانے میں کامیاب رہی ہیں۔ اُن کے آرٹ کے کاموں کی قیمت پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور اُن کے آرٹ کے تئیں لگاؤ اور دلچسپی نے ہندوستانی جدید و معاصر آرٹ کو اور زیادہ مضبوط بنایا ہے۔ ان قابل ذکر خواتین نے آرٹ کو نہ صرف فن کے لیے بلکہ اس سے Self Transformation tool کی شکل میں مدافعتی اور مخالفتی صورت میں اپنا کر اسے اپنی ان کہی کہانیوں کو بتانے کے لیے استعمال کیا ہے۔

❑❑❑

Naseem Sayeed
M.M. Rabbani High School
Kamptee-441001 (Maharashtra)

ثمینہ بیگم

حیدرآبادی ڈھولک کے گیت

(تہذیبی، ادبی اور لسانی اہمیت)

"لوک گیت" عوامی ادب کی مشہور صنف سخن ہے۔ یہ ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ عوام کے داخلی جذبات کا فطری اظہار ہے ان میں خصوصیت سے خواتین کے جذبات کا بے اختیار اور ان کے احساسات کا بھرپور بیان ہوتا ہے۔ کسی مخصوص مقام یا وہاں کے معاشرے کو جاننا ہو تو وہاں کے لوک گیتوں کا مطالعہ ہمارے لیے بہت ہی کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ "لوک گیت" عوام کا وہ زبانی سرمایہ ہے، جس میں معاشرے کی حقیقی تصویر موجود ہوتی ہے۔

اُردو زبان میں لوک ادب کی بات کی جائے تو اس کی بڑی قدیم اور اہم تاریخی اہمیت ہے۔ اُردو لوک ادب میں گیتوں کی لسانی، ادبی، تاریخی وثقافتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لوک گیتوں میں کئی طرز کے گیت ہوتے ہیں ان ہی میں ایک قسم ڈھولک کے گیتوں کی ہے، جن میں خواتین کی تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے۔

لوک گیتوں میں وہ گیت جو ڈھولک کی تھاپ پر گائے جاتے ہیں "ڈھولک کے گیت" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان گیتوں کی کوئی خاص ہیئت یا تکنیک نہیں ہے۔ یہ صرف ڈھولک کی تھاپ پر، سر اور تال کے ساتھ ساتھ تالیوں کی گونج میں اپنا اصلی چہرہ دکھاتے ہیں۔ کبھی ٹیپ کے مصرعہ کی طرح ایک مصرعہ کو بار بار دہرایا جاتا ہے کبھی ردیف، کبھی قافیہ تو کبھی ہم وزن الفاظ گیتوں میں آہنگ پیدا کرتے ہیں، لیکن اس کی ظاہری ہیئت کے اصول متعین نہیں ہیں۔ گیت کی مختلف قسمیں ہیں اور متنوع موضوعات پر گیت موجود ہیں۔ زندگی کے ہر اہم موقع کے لیے گیت بنائے گئے ہیں۔

تقریب میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء ہوتی ہے اور رسول اکرم ﷺ سے محبت وعقیدت کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بزرگان دین اولیائے کرام سے محبت وعقیدت کا اظہار بھی ان ڈھولک کے گیتوں میں شامل ہے۔ جیسے:

(1) "میں مدینہ کی مئے زن جو ہو سو ہو"

(2) "مدینہ لے چل مدینہ جانے والے"

(3) "لے کے معراج چلے کاندھے پہ احمد کا قدم"

(4) "مجھے آپ نے بلایا یہ کرم نہیں تو کیا ہے"

حیدرآباد میں کسی بھی خوشی کی تقریب کی شروعات ہی ڈھولک کے گیتوں سے ہوتی ہے جب کسی گھر میں کوئی تقریب عمل میں آتی ہے تو سب سے پہلے یعنی دلہن سے بھی پہلے دالان میں ڈھولک کو لایا جاتا ہے اور عورتیں یا مراثنیں گیتوں کی شروعات کرتی ہیں۔ تمام عورتوں میں سے کوئی ایک عورت ڈھول بجاتی ہے اور باقی ساری عورتیں تالیاں بجاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر اور رسول اکرم ﷺ و بزرگانِ دین سے محبت وعقیدت کا نذرانہ پیش کرنے کے بعد میزبانوں کو دعاؤں کے ساتھ مبارک بادی پیش کی جاتی ہے۔ جیسے:

(1) ''یہ گھر تو سلامت رہو مہمان بہت ہیں''
(2) ''خانے آباد یہ دربار مبارک ہووے''
(3) ''خدا نے دن یہ دکھلایا''

حیدرآبادی ڈھولک کے گیتوں میں شہر حیدرآباد کے معاشرے کی حقیقی تصویریں موجود ہیں کیونکہ یہاں کے گیتوں میں رسم و رواج کی تفصیل بیان ہے تو کبھی رہن سہن کا طریقہ، کہیں نند بھاوج کی چھیڑ چھاڑ تو کبھی ساس بہو کے درمیان ہوئی ان بن کا تذکرہ اور کبھی ہجر و وصال کی کیفیتیں گیتوں میں ڈھلتی ہیں تو کبھی انسانی زندگی کے رشتے سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہ بھی بات قابل غور ہے کہ ان گیتوں کے تخلیق کار کوئی مشہور و معروف شخصیت نہیں بلکہ ہمارا پورا معاشرہ ہوتا ہے جس کی بنیاد پر گیتوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوتا گیا اور عوام کی دلچسپی بڑھتی گئی۔

گیت گانے کے دوران ہی ''دلہن کو لاؤ'' کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جب دلہن شائستہ لباس میں ملبوس اور انوکھی خوشبو سے معطر محفل میں داخل ہوتی ہے تو ساری نگاہیں اسی پر جم جاتی ہیں، گیت کے موضوع میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اس وقت عورتیں یا مراثیں یہ گیت گاتی ہیں:۔

''آئی بنو آئی ، ہریالی بنو آئی''
''بنے تیرے جیبوں کو ہرے لگے ہیں''
''دکلان میں پنائے ہار کیا خوشنما لگا کہ''

حیدرآبادی ڈھولک کے گیت ہماری تہذیبی اور سماجی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ یہاں کے امیر و غریب، خوشی کے موقع پر گیت گا کر یا مراثیوں سے گوا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ خاص کر عوامی سطح پر، حیدرآبادی خواتین رات رات بھر ڈھولک کی تھاپ پر گیت گا کر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتی ہیں جن میں کم عمر لڑکیوں سے لے کر بڑی بوڑھیاں تک بھی شامل ہوتی ہیں۔ حیدرآبادی ڈھولک کے ان گیتوں میں رشتوں کی اہمیت بھی ہے اور تمام آپسی رشتوں کا ذکر بھی۔ جیسے:

''مدت سے تھا ارمان کہ بیٹا میرا دلہا بنے گا''

حیدرآباد میں شادی والے گھر میں جب شادی ہوتی ہے تو چھت سے ایک لال رنگ کے کپڑے کو باندھا جاتا ہے جو چمکیوں سے سجا ہوا ہوتا ہے۔ جس کے اندر پان اور پیسے رکھے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ملیدہ وغیرہ بھی رکھتے ہیں۔ ہر جگہ ہر رسم میں کچھ نہ کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ اس منڈپ کے نیچے لکڑی کی چوکی رکھی جاتی ہے جس پر لال رنگ کا کپڑا بچھایا جاتا ہے۔ گھونگٹ ڈال کر جب دلہن کو اس چوکی پر بٹھایا جاتا ہے تو ساری عورتیں اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور جب رسموں کی ادائیگی میں تاخیر ہونے لگتی ہے تو وہ یہ گیت گاتی ہیں:

گھونگٹ میرا بھیگ رہا مارے گرمی سے
مارے گرمی سے، بہت گرمی سے — گھونگٹ۔۔۔۔
خالایاں بلاؤ، ہلدی لگاؤ، لگاؤ جلدی سے
بیٹھاؤ جلدی سے، لگاؤ جلدی سے — گھونگٹ۔۔۔۔

اس گیت کے تمام مصرعوں میں تقریب کے ایک کے بعد دیگر رسموں کا ذکر ملتا ہے یہ گیت بہ ظاہر عورتیں یا مراثنیں گاتی ہیں لیکن دلہن کی

زبانی رسموں کی جلد سے جلد ادائیگی کا مطالبہ کرتی ہیں کیونکہ دلہن کا گھونگٹ گرمی کی وجہ سے پسینہ میں تربہ تر ہوتا ہے۔

ایک اور گیت بھی اسی طرز میں جو مہمانوں کی زبانی ہے کہ:

''دلہن میری تپ رہی گرمی سے
ہائے بڑی گرمی سے۔۔۔''

گھونگٹ کے موضوع پر ایک اور گیت کچھ اس طرح ہے:

''گھونگٹ کوئی آ کر ہٹا دے''

حیدرآبادی ڈھولک کے گیتوں میں شادی کی تمام رسموں سے متعلق ایسے کئی گیت موجود ہیں جس میں ہر ایک رسم کی تفصیل موجود ہے جیسے ہر رسم کے الگ الگ موقع پر اُسی لحاظ سے عورتیں بڑے جوش وخروش سے گاتی ہیں۔

بعض اوقات تقریب کے اختتام پر بھی یہاں کی عورتوں سے ڈھول نہیں چھوٹتا ہے۔ وہ تقریب سے ہٹ کر بھی گیت گاتی ہیں۔ مثلاً یہ گیت دیکھیے جس میں عورتیں میزبان سے چائے کی فرمائش کس طرح کرتی ہیں:

''پاوڈر ہو گیا کھلاس　　پتی لا دو نا اُدھار
چائے کیوں نہ پلاتے　　چائے کیوں نہ پلاتے''

اس گیت میں مہمان میزبان سے اپنے کپڑے، زیور، گھر اور گاڑی وغیرہ بیچ کر اس رقم سے چائے پلانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس گیت کے برخلاف ایک اور گیت ہے جو میزبان کی زبانی خود اپنی ہی کنجوسی کا تذکرہ محفل کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔

''دریا میرا دل گے، میں کاج کریوں نا''

جس طرح مخمل کی شال میں جوتا لپیٹ کر مارا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس گیت میں میزبان کو دریا دل بتاتے ہوئے اس کی کنجوسی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح گیتوں کے ذریعہ دونوں ایک دوسرے پر طنز کرتے اور مذاق اڑاتے ہیں جس کا مقصد دل آزاری نہیں بلکہ آپس میں بے تکلفی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جو اس نئی رشتہ داری کو آپس میں مضبوطی سے باندھنے کا باعث ہوتا ہے۔ جب وہ آپس میں ایک دوسرے پر طنز کرتی ہیں تو وہ طنز قابل اعتراض ہونے کے باوجود کوئی بھی ناراض نہیں ہوتا بلکہ خوب ہنستے مسکراتے ہیں اور ان گیتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

''آئیو ماں دولہے کے ناقدریں لوگاں''

''دولہا گاؤں کا گنوار دلہن بولتی پی نیں''

حیدرآباد میں گیتوں کے وجود کا ابتدائی دور کچھ اس طرح سے تھا کہ عورتیں صبح سویرے اُٹھ کر چکی پیسنے بیٹھ جاتیں اپنی تھکن دور کرنے کے لیے وہ کچھ نہ کچھ گنگناتی تھیں جس سے جہاں ان کی تھکن دور ہو جاتی تھی وہیں انھیں اپنی زندگی اور اپنے خاندان کے بارے میں اپنے دل کی بات بتانے کا موقع مل جاتا تھا۔ عورتوں کی اس عادت سے فائدہ اُٹھا کر بزرگانِ دین، صوفی وسنت وغیرہ نے اسلامی تعلیمات کو عورتوں میں عام کرنے لیے گیت لکھے۔ عورتوں کے ذریعہ ہی عورتوں میں اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا یہ ایک بہترین ذریعہ تھا۔

اس کے علاوہ بچے کو سلانے کے لیے جھولا جھلاتی ہوئی عورتیں جو گیت گاتی ہیں اُن میں بھی مذہبی رنگ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ آہستہ آہستہ بعد میں چکی نے ڈھول کی جگہ لے لی اور عورتیں اپنی تفریح وطبع کے لیے گیت گانے لگیں۔ لہٰذا کہیں نہ کہیں وہی مذہبی رنگ، فلسفیانہ انداز ہمیں ڈھولک کے کئی گیتوں میں نظر آتا ہے، جیسے:

''آسماں سے اُتارا گیا
زندگی دے کے مارا گیا''

جب حیدرآباد کے ہر گھر میں ڈھول تفریح وطبع کا ذریعہ بن گیا تو غریب گھر کی عورتیں خود ڈھولک پر گیتوں کو گانے لگیں لیکن امیر گھرانوں کی عورتیں جس طرح ہر کام اپنی لونڈیوں ونوکرانیوں سے کرواتی آئی ہیں ٹھیک اُسی طرح گیتوں کو دوسری عورتوں کے ذریعے سننے لگیں اسی وجہ سے ایک نیا طبقہ ''مراثنوں'' کے نام سے وجود میں آیا جو امیر گھرانوں میں یا نوابوں کے یہاں گیتوں کو گا کر اُن سے انعام واکرام حاصل کرنے لگیں۔

سمدن کا ذکر آئے بغیر حیدرآبادی ڈھولک کے گیتوں کا تصور تھوڑا کم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ گیت۔

''سمدن میری بھولی بھالی گے ماں''

''ادرک کا چوبا چبا دونگی　　سمدن جانے نہ دونگی''

ڈھولک کے گیتوں میں ''سمدن'' نام ہی مزاح کا موضوع نہیں بلکہ، نند، بھاوج، دیور، وغیرہ بھی گیتوں میں مزاح پیدا کرتے ہیں۔ جیسے:

''ہری مرچی ماں میری نند''

ڈھولک کے گیتوں میں سمدن سے متعلق ایک ایسا گیت بھی ہے جس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ چارمینار کے حدود میں جو گلیاں موجود ہیں وہ کس نام سے مشہور ہیں اور وہاں پر کون کون سی دوکانیں موجود ہیں۔

''سمدن کھوگئی ماں، چارمینار کی سڑک پو''

حیدرآبادی ڈھولک کے گیتوں میں ایسے مزاحیہ گیت بے شمار ہیں جس میں عورتیں اپنے آپسی رشتے کی بنیاد پر ایک دوسرے پر طنز کر کے مثلاً شکل وصورت یا عادات واطوار یا پھر چوری کا الزام لگا کر مزاح پیدا کرتی

ہیں۔1980 میں جب ریڈیو پر ڈھولک کے گیتوں کا پروگرام آتا تھا تو ساری عورتیں جلدی جلدی اپنا کام ختم کر کے ایک جگہ جمع ہو جاتی تھیں اور بڑے شوق سے گیتوں کو سنا کرتی تھیں۔ان گیتوں میں ایک بہت مشہور گیت یہ ہے:

''سنو محلے والوں میری کالی مرغی کھو گئی نا''

ڈھولک کے گیت حیدرآبادی تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہیں اور ڈھولک ایک ایسا ساز ہے جسے ہمیں ہمارے بزرگوں نے وراثت میں دیا ہے۔جس طرح مہندی لگائی جاتی ہے اس طرح ڈھولک پر صندل کے پانچ ٹیکے لگائے جاتے ہیں، لال رنگ کی ڈوری باندھی جاتی ہے تب عورت اسے بجانا شروع کرتی ہے۔ ڈھولک کے علاوہ دنیا کے کسی بھی ساز کو اتنا مان نہیں دیا جاتا جتنا کہ ڈھولک کو دیا جاتا ہے۔ڈھولک پہلے ہر گھر میں ہوا کرتا تھا جس کے گھر میں ڈھولک نہیں ہوتا تھا وہ کسی اور سے نیگ دے کر مانگ لاتے تھے، اور پھر تقریب کے اختتام پر اسے بڑے احترام کے ساتھ واپس کر دیتے تھے۔

''گیت'' کبھی اظہار ہے خدا کی وحدت کا تو کبھی ماں کی ممتا کا، اور کبھی محبت و پیار کا تو کبھی عقیدت کا۔کبھی ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کا تو کبھی دلی خواہشوں، خوشیوں اور مسرتوں کی بہار کا۔گیتوں کی اہمیت و افادیت مسلّم ہے یہ ہر دور میں عوامی لب و لہجہ کے ساتھ دلی جذبات و خواہشات کے اظہار میں پیش پیش رہے ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ گیت مذہبی، سماجی و تہذیبی معاشرتی اور لسانی اعتبار سے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

جب عاشق و معشوق کا ذکر آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی آسمان سے چاند تارے توڑ لانے کی باتیں بھی ہوتی ہیں یا پھر پہاڑوں سے دودھ کی نہر نکالنے کا تذکرہ ہوتا ہے۔لیکن حیدرآبادی ڈھولک کے گیتوں میں میاں اپنی بیگم سے کہتا ہے کہ:

''لوٹھے میں گھڑا ڈوباؤں کیا بیگم تیرے لئے''

اس طرح وہ اپنی بیگم کی محبت میں ماں باپ کو چھوڑ دیتا ہے تو کبھی بھائی بہنوں کو۔اس گیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عورتیں گیتوں میں صرف اپنے ہی جذبات کا اظہار نہیں کرتیں بلکہ وہ مردوں کے جذبات کو بھی پیش کرتی ہیں۔

ڈھولک پر گایا جانے والا ہر گیت ہمیں ہنساتا ہے یا مسکرانے پر مجبور کرتا ہے ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ بلکہ کچھ گیت ایسے ہیں جسے سُن کر آنکھوں میں آنسو آ ہی جاتے ہیں، جیسا کہ بدائی پر گایا جانے والا یہ گیت:

''کیسے مسافر کو دی گے میری اماں
لے کے چلا پردیس گے میری اماں''

یہ تو دلہن کے جذبات تھے۔دولہے میاں کے جذبات کچھ اس طرح ہوتے ہیں:

''اپنی بنی لے چلے سردار ہو''

یہ تمام گیت ہندوستانی تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ بڑے بزرگوں کا کہنا درست ہے کہ'' جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ دل تک ضرور پہنچتی ہے۔''لہٰذا گیت بھی ایسی ہی ایک صنف ہے جس کی تشکیل عوام کے ذریعے ہوتی ہے، اور جو اپنی بھولی بھالی فطرت و حقیقی جذبات کی وجہ سے معصوم عوام کے چہروں کے تاثرات سے ظاہر ہوتی ہے اور مختلف

جذبات وکیفیات سے عوام کے دلوں کو مہکا دیتی ہے۔

اب چونکہ گیتوں کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے تو لوگ گیتوں کو بھی فراموش کرتے جا رہے ہیں اور فلمی گیتوں کو ڈھولک کی تھاپ پر گایا جا رہا ہے۔ لیکن جب ڈھولک کے گیتوں کو عروج حاصل تھا تو فلموں میں بھی ڈھولک کے گیتوں کو گایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر 1982 میں حیدرآبادی معاشرے پر مبنی فلم جس کا نام "بازار" ہے۔ ارجمند نظیر صاحبہ کی آواز میں یہ ڈھولک کا گیت فلمایا گیا ہے:

"چلے آؤ سیّا رنگیلے میں واری رے"

فلم "چاندنی" کا یہ گیت 'میں سسرال نہیں جاؤں گی، ڈولی رکھ دو کہارو' اسی طرز کا ہے۔ ایک اور ڈھولک کا گیت جو کہ بہت پرانا ہے جسے ڈھولک کی تھاپ پر گایا جاتا رہا ہے:

"امی جان باڑے میں موٹر کس کی آئی جی"

ڈھولک کے گیتوں کی زبان کا مقامی بول چال کی زبان سے بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے شاید اسی لیے یہ عوام سے بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ لہٰذا حیدرآبادی ڈھولک کے تمام گیتوں کے الفاظ، محاورے، تشبیہات، استعارے وغیرہ بھی کچھ مقامی بول چال (دکنی) کی زبان سے آئے ہیں۔ لہٰذا حیدرآبادی ڈھولک کے گیتوں میں معیاری لفظیات کی بہ نسبت مقامی لفظیات زیادہ ہے اور یہی چیز دل سے دل تک کسی بھی بات یا جذبہ کو پہنچانے کے لیے راہ ہموار کرتی ہے، لہٰذا سارے ہندوستان کے گیتوں کو اکٹھا کر کے انھیں دوبارہ علاحدہ علاحدہ کرنے میں یہی مقامی لفظیات ہماری مدد کے لیے کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ جیسا کہ حیدرآباد میں دکنی زبان کی لسانی خصوصیات، واحد جمع کے قواعد، لاحقے سابقے وغیرہ اور لفظیات، باتاں، راتاں، بولیچ، سنیچ، نکّوں، نیں وغیرہ سے ہم اپنے دکنی گیتوں کی پہچان آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں مثلاً ان گیتوں پر غور فرمائیے:

1: "میں نکّو نکّو نکّو بولی تو گئی نا دلہنیا۔۔۔۔۔۔۔"

2: "جاگے جاگے نندیا تم جاگے ساری رات مجھے نیں معلوم نا۔۔۔۔۔"

3: "بنی پو سے کیا کیا واروں ماں۔۔۔۔۔۔"

4: "آئیو ماں! دلہے کے ناقدرے لوگاں۔۔۔۔۔"

5: "آؤ سہاگیناں منڈوے میں آنا۔۔۔۔۔"

سلیمان خطیب جو کہ ایک مشہور شاعر تھے آپ کا لکھا ہوا "بولو خالا مزاج کیسا ہے" ڈھولک کی تھاپ پر گایا جاتا ہے جس میں حیدرآبادی زبان میں رشتہ کی بات اور جہیز کا تذکرہ بیان کیا گیا ہے۔

"حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد"

یہ ڈھولک کا گیت نہیں بلکہ غالب کا شعر ہے لیکن ڈھولک کے گیتوں میں ایسا ہی واسوخت کا انداز بھی موجود ہے۔ غالب کے اس شعر کی طرح ایسا ہی ایک ڈھولک کا گیت بھی ہے ملاحظہ فرمائیں:

"کون سہے گا تیرا ظلم و ستم میرے بعد"۔

جہاں محبت ہوتی ہے وہاں شکوے شکایتیں بھی بے شمار ہوتی ہیں اور روٹھنا منانا تو پل پل لگا رہتا ہے لہٰذا حیدرآبادی ڈھولک کے گیتوں کے ذریعہ ان تمام چیزوں کا اظہار بھی تفصیل کے ساتھ ہوتا ہے۔ مثلاً:

"اے ستم گر تیرا مسکرانا کام آنے کے قابل نہیں ہے"

"آج بازی لگائے بیٹھی ہوں"

"بھائی ہمارے ہو گئے بھابی کے دیوانے اللہ" اس گیت میں بہ ظاہر بھائی سے شکایت ہے پر بھابی کی تعریف بھی پوشیدہ ہے۔ ڈھولک کے گیتوں میں ایک ایسا گیت بھی ہے جس میں نند اپنی بھابھی سے کسی اور کی شکایت کرتی ہے کہ:

"بھابی جان! بمبئی کی گاڑی سوار لیا

ڈھولک کے گیتوں میں مقامی تہذیب، رسم و رواج، پکوان کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یعنی حیدرآباد میں جو موسیٰ ندی کی طغیانی کا تاریخی واقعہ ہے۔ ڈھولک کے ایک گیت میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔

"دیکھو موسیٰ کا ہے یہ فسانہ سن کے حیرت ہے سارا زمانہ"

حیدرآبادی ڈھولک کے گیتوں میں ہولی اور پتنگ بازی بھی موجود ہے جس سے یہاں کی مشترکہ تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔

ہمارے یہ حیدرآبادی ڈھولک کے گیت موجودہ دور میں چونکہ زوال پذیر ہو رہے ہیں جس کی سب سے بڑی وجہ مغربی کلچر ہے جس کے زیر اثر یہاں پر شادی بیاہ کے موقع پر آرکسٹرا کا اہتمام کیا جاتا ہے اس کے برخلاف گیت گانے کی رسم زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے۔ ان گیتوں کو ہم زبانی ادب سے نکال کر تحریری ادب میں منتقل کر سکتے ہیں جس سے ہمارا یہ قیمتی سرمایہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ ہو سکے۔

□□□

Sameena Begum
Ph.D Research Scholar
Usmania University
Hyderabad-500007 (T.S)

معصوم زہرا

خواتین کو بااختیار بنانے کے اہداف اور حقیقت

آج کے ترقی یافتہ دور کا تقاضہ ہے کہ معاشرے کو صنفی امتیاز سے پاک کیا جائے۔ عورتوں کو ان کا اصل مقام اور بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں۔ ساتھ ہی یہ شعور بھی بیدار ہو کہ دنیا میں تمام انسان قابل احترام ہیں اور ان کے حقوق یکساں ہیں۔ تعلیم، صحت اور مناسب روزگار ہر انسان کا حق ہے اور اسے ملنا چاہیے۔ خواتین کو بااختیار بنانے کا مطلب خواتین کو ذہنی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی طور پر بااختیار بنانا ہے۔ خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے ذیل کی چند صلاحیتوں کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے:

☆ خود فیصلے کرنے کی طاقت وصلاحیت ہو۔

☆ صحیح فیصلے لینے کے لیے معلومات اور وسائل کی فراہمی۔

☆ انتخاب کے لیے ایک سے زائد وسائل ہوں (صرف ہاں، نہیں، یہ، وہ) نہ ہوں۔

☆ اجتماعی فیصلے کے معاملات میں اپنی بات پرزور طریقے سے رکھنے کی صلاحیت۔

☆ تبدیلی لانے کے لیے مثبت خیالات کا پایا جانا۔

☆ اپنی انفرادی یا اجتماعی طاقت کو بہتر بنانے کے لیے مہارت حاصل کرنے کی صلاحیت۔

☆ دوسروں کے نظریات کو جمہوری طریقے سے تبدیل کرنے کی صلاحیت۔

☆ خود کی مثبت شبیہ کو مزید بہتر بنانا اور کمزوریوں کو دور کرنا۔

صنفی مساوات کو ہندوستانی آئین کے دیباچہ میں، بنیادی حقوق، بنیادی فرائض اور پالیسی بنانے میں شامل کیا گیا ہے۔ آئین نہ صرف خواتین کو برابری کا درجہ دیتا ہے بلکہ ریاست کو بھی یہ اختیار فراہم کرتا ہے کہ وہ خواتین کے حق میں مثبت اقدامات کرے۔ ہندوستان میں خواتین تعلیم، سیاست، میڈیا، فن وثقافت، سروس سیکٹر، سائنس اور ٹکنالوجی وغیرہ کے شعبوں میں نمایاں شراکت دار ہیں۔ گرچہ اس کا فیصد بہت کم ہے لیکن آہستہ آہستہ اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

1970 کی دہائی کے آخر میں ہندوستان میں خواتین کی تحریک نے زور پکڑا۔ متھرا عصمت دری کا معاملہ قومی سطح پر اٹھنے والے معاملات میں سے ایک تھا، جس نے خواتین کو متحد کرنے کا کام کیا۔ 1979-80 میں متھرا کے تھانے میں ایک لڑکی کی عصمت دری کرنے والے پولیس اہلکاروں کو بری کیے جانے کی وسیع پیمانے پر مخالفت ہوئی۔ ان مظاہروں کو قومی میڈیا میں وسیع پیمانے پر دکھایا گیا اور حکومت کو گواہی قانون، فوجداری ضابطہ اخلاق اور ہندوستانی پینل کوڈ میں ترمیم کرنے کے علاوہ نگرانی میں عصمت دری کے زمروں میں تقسیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مظاہرہ کرنے والی خواتین بچیوں کا قتل، جنسی تفریق، خواتین کی املاک اور خواتین کی خواندگی جیسے معاملات پر متحد ہوئیں۔

ہندوستان میں شراب نوشی کو اکثر خواتین پر مظالم سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ کئی خواتین تنظیموں نے آندھرا پردیش، ہماچل پردیش، ہریانہ، اڑیسہ، مدھیہ پردیش اور دیگر ریاستوں میں شراب مخالف مہم شروع کیں۔ 1990 کی دہائی میں غیر ملکی خیراتی ایجنسیوں کے مالی تعاون کے نتیجے میں خواتین پر مرکوز غیر سرکاری ادارے قائم کرنا ممکن ہوا۔ خود مدد کرنے والی تنظیمیں اور این جی اوز جیسے سیلف ایمپلائڈ ویمن ایسوسی ایشن (SEWA) نے ہندوستان میں خواتین کے حقوق کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مقامی تحریکوں سے بہت سی خواتین قومی سطح پر قائد کے طور پر ابھری ہیں۔ مثال کے طور پر نرمدا بچاؤ آندولن کی میدھا پاٹیکر وغیرہ۔ حکومت ہند نے 2001 میں خواتین کو بااختیار بنانے کا سال (سوشکتی) قرار دیا اور اسی برس خواتین کو بااختیار بنانے کی پالیسی منظور کی گئی۔

آئین ہند تمام ہندوستانی خواتین کو برابری کا حق دیتا ہے۔ (دفعہ 14) ریاست صنفی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کر سکتی۔ (دفعہ 15۔(1)) کے تحت سبھی کو برابر مواقع کا حق حاصل ہے۔ (دفعہ 16) برابر کام کے لیے خواتین کو برابر تنخواہ کا حق دیتی ہے۔ ہمارا آئین (دفعہ 39 (د)) ریاست کے ذریعہ خواتین اور بچوں کے حق میں خصوصی دفعات (دفعہ 15 (3)) کی بھی اجازت دیتا ہے۔ خواتین کے عزت و وقار کے لیے بدسلوکی کی چلی آرہی روایت کا ترک کرنا (سیکشن 51 (اے) (ای)) اور ریاست کے ذریعہ کاموں کی منصفانہ اور انسانی اقدار کی بنیاد پر زچگی جیسی صورت میں راحت کو یقینی بنانے کی آئین کی (دفعہ 42) میں اجازت دی گئی ہے۔

جمہوری نظام حکومت میں ہمارے قوانین، ترقیاتی پالیسیاں، منصوبے اور پروگرام مختلف شعبوں میں خواتین کی ترقی کے لیے مرتب کیے گئے ہیں۔ پانچویں پانچ سالہ منصوبہ (1974-78) سے، خواتین سے متعلق معاملات میں فلاح و بہبود کے بجائے ترقی کے نظریہ کو اپنایا جارہا ہے۔ حالیہ برسوں میں خواتین کی حالت بہتر بنانے کے لیے خواتین کو بااختیار بنانا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ خواتین کے حقوق اور قانونی حقوق کے تحفظ کے لیے 1990 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعہ قومی خواتین کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستانی آئین کی 73ویں اور 74ویں ترمیم (1993) میں خواتین کے لیے پنچایتوں اور علاقائی بلدیاتی اکائیوں میں ریزرویشن دیا گیا۔ جو مقامی سطح پر فیصلہ سازی کے عمل میں خواتین کی شراکت کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔

میکسیکو ایکشن پلان (1975)، نیروبی کے فارورڈ اسٹریٹیجز (1985)، بیجنگ ڈیکلیریشن اینڈ پلیٹ فارم فار ایکشن (1995)، صنفی مساوات، ترقی اور امن پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اجلاس کے ذریعہ 21 ویں صدی کے لیے ''بیجنگ اعلامیہ اور ایکشن کے لیے پلیٹ فارم'' نافذ کرنے اور اقدامات کے لیے مناسب دستاویزات ہندوستان میں تحریر کیے گئے ہیں۔

ایک طرف آئین، قانون سازی، پالیسیاں، منصوبے، پروگرام اور متعلقہ میکانزم میں جو اہداف حاصل کیے گئے ہیں اور دوسری طرف ہندوستان میں خواتین کے تعلق سے جو صورتحال ہے اس میں درحقیقت ایک بہت بڑا فرق نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں خواتین کی صورتحال پر کمیٹی کی رپورٹ ''سماننا کی اور'' 1974 میں تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ خواتین کے لیے قومی تناظر میں بنایا گیا منصوبہ، 2000-1988، سرم شکتی رپورٹ 1988 اور کارروائی کے لیے پلیٹ فارم کو جائزہ کے بعد پانچ سالوں میں دکھایا گیا ہے۔

صنفی نابرابری ہمارے سامنے کئی شکل میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ جن میں سب سے اہم گزشتہ چند دہائیوں میں خواتین کے تناسب میں مسلسل نمایاں کمی ہے۔ گھریلو اور معاشرتی قدامت پسندی اور تشدد اس کی کچھ دوسری شکلیں ہیں۔ ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں بچیوں، نوعمر لڑکیوں اور خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک جاری ہے۔ صنفی امتیاز کی بنیادی وجوہات سماجی اور معاشی ڈھانچے سے جڑی ہوئی ہیں جو رسمی اور غیر رسمی ریتی رواج پر مبنی ہیں۔

خواتین اور خاص طور پر ایس سی، ایس ٹی، او بی سی اور اقلیتوں سمیت کمزور طبقات سے وابستہ خواتین جو زیادہ تر دیہی علاقوں اور غیر منظم علاقوں میں رہتی ہیں۔ وہ تعلیم، صحت سمیت زندگی کی کئی اہم سہولیات سے محروم ہیں۔ خواتین کے لیے چلائے جانے والے پروگراموں اور اسکیموں کا مقصد خواتین کی ترقی اور ان کو بااختیار بنانا ہے۔ اس پالیسی کو وسیع پیمانے پر پھیلانا چاہئے تاکہ اپنے اہداف حاصل کرنے کے لیے تمام فائدہ حاصل کرنے والوں کی حصہ داری کو یقینی بنایا جا سکے۔

خواتین کو معاشی طور پر بااختیار بنانا:

غربت کا خاتمہ:

غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں میں خواتین کی بڑی آبادی ہے اور وہ بیشتر حالات میں انتہائی غربت میں زندگی گزار رہی ہیں۔ سماج کی کڑوی سچائی کو مدنظر رکھتے ہوئے معاشی پالیسیوں اور غربت کے خاتمے کے پروگرام، خواتین کی ضروریات اور مسائل کا خاص طور پر حل

کریں گے۔ اس طرح کے پروگراموں کے نفاذ کو بہتر بنانا ہوگا جو خواتین کے لیے پہلے ہی مخصوص اہداف سے وابستہ خواتین کے لیے بنائے گئے ہیں۔ خواتین کی صلاحیتوں کو بڑھانے کے لیے ضروری معاون اقدامات کے ساتھ ساتھ ان کو بہت سے معاشی اور معاشرتی اختیارات بھی دیئے جانے چاہئیں۔ غریب خواتین کو متحد کرنے اور خدمات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے اقدامات اٹھائے جائیں۔

مائیکرو کریڈٹ:

کھپت اور پیداوار کے لیے خواتین تک رسائی میں اضافہ کرنے کے لیے نئے مائیکرو کریڈٹ سسٹم اور مائیکرو فنانشل ادارے بنائے جائیں اور کریڈٹ تک رسائی بڑھانے کے لیے موجودہ مائیکرو کریڈٹ سسٹم اور مائیکرو فنانشل اداروں کو مضبوط بنایا جائے۔ موجودہ مالیاتی اداروں اور بینکوں کے ذریعہ قرضوں کی مناسب فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کئے جائیں، تاکہ سطح افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والی تمام خواتین کو آسانی سے قرض مل سکے۔

خواتین اور معیشت:

خواتین کی شمولیت کو ادارہ جاتی بنا کر معاشی اور معاشرتی پالیسیاں مرتب کر کے خواتین کے حق میں ان کا نفاذ کیا جائے۔ بطور پروڈیوسر اور مزدور، سماجی واقتصادی ترقی میں ان کی شراکت کو باضابطہ اور غیر رسمی (گھر پر کام کرنے والے کارکنوں سمیت) شعبوں میں تسلیم کیا جانا چاہیے اور ملازمت سے متعلق مناسب پالیسیاں مرتب کی جانی چاہئیں۔

خواتین کو معاشرتی طور پر با اختیار بنانا:

تعلیم:

خواتین اور لڑکیوں کے لیے تعلیم کو یقینی بنانا۔ امتیازی سلوک کا خاتمہ، تعلیم کو ہر فرد تک پہنچانا، ناخواندگی کو دور کرنا، حساس صنفی تعلیمی نظام تشکیل دینا، لڑکیوں کے داخلے اور خوشحالی کی شرح میں اضافہ کرنے اور خواتین کے ذریعہ ملازمت، پیشہ ورانہ، فنی مہارت کے ساتھ ساتھ تعلیم کو آسان اور معیاری بنانے کے لیے خصوصی اقدامات کئے جائیں۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں صنفی اختلافات کو کم کرنے کے لیے توجہ دی جانی چاہئے۔ موجودہ پالیسیوں کے میدان میں اہداف لڑکیوں اور خواتین پر خصوصی توجہ کے ساتھ حاصل کیے جائیں، خاص طور پر لڑکیاں اور کمزور طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین جن میں ایس سی، ایس ٹی، دیگر پسماندہ طبقات اور اقلیتیں شامل ہیں۔ صنفی تفریق کے رجحانات کو صنفی امتیازی سلوک کی ایک بنیادی وجہ کے طور پر حل کرنے کے لیے نظام تعلیم میں اس پہلو کی طرف توجہ دے کر اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لیے لازمی طور پر سنجیدگی سے بیداری پروگرام چلائے جائیں۔

صحت:

خواتین کی صحت جس میں تغذیہ اور صحت کی خدمات دونوں شامل ہیں، کے تئیں سنجیدگی اپنائی جائے اور زندگی کے ہر شعبے میں خواتین اور لڑکیوں کی ضروریات پر خصوصی توجہ دی جانی چاہئے۔ بچوں کی اموات اور زچگی کی شرح اموات میں کمی، جو انسانی ترقی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کو کم کرنے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ یہ پالیسی بچوں کی اموات (IMR)، زچگی کی شرح اموات (MMR) کے قومی اعداد و شمار کے قومی مقاصد کو دہرا رہے ہیں، جو قومی آبادی کی پالیسی 2000 میں دکھائی گئی ہے۔ خواتین کو جامع، سستی اور معیاری صحت کی سہولیات حاصل ہونی چاہئیں۔ خواتین کو ان کے تولیدی حقوق، صنف اور صحت سے متعلق مسائل جیسے ملیریا، تپ دق اور پانی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کے ساتھ ساتھ ہائی بلڈ پریشر اور دل کی بیماری پر دھیان دیا جانا چاہئے۔

آبادی پر قابو پانے کی پالیسی کی روشنی میں اس اہم ضرورت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ مرد اور خواتین کی خاندانی منصوبہ بندی کے محفوظ، موثر اور سستے طریقوں تک رسائی حاصل ہونی چاہیے اور بچپن کی شادی اور بچوں کی پیدائش میں وقفہ رکھنے جیسے مسائل مناسب طریقے سے حل کیے جانے چاہئیں۔ تعلیم کے پھیلاؤ، شادیوں کے لازمی رجسٹریشن اور بی ایس وائی جیسے خصوصی پروگرام شادی کی عمر میں تاخیر پر اثر ڈالیں گے تاکہ بچپن کی شادی کے رواج کو ختم کیا جا سکے۔

صحت کی دیکھ بھال اور تغذیہ کے بارے میں خواتین کے روایتی علم کو تسلیم کیا جائے گا اور مناسب دستاویزات کے ذریعے استعمال کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔ خواتین کو دستیاب طبی خدمات کے بنیادی ڈھانچے کے فریم ورک کے اندر ہندوستانی اور علاج کے متبادل طریقوں کے استعمال کو فروغ دینے کی بات کی گئی ہے۔

غذائیت:

تینوں اہم مراحل یعنی بچپن، جوانی اور تولیدی مرحلے کے دوران خواتین کو غذائیت کی کمی اور بیماری کا زیادہ خطرہ رہتا ہے۔ لہٰذا خواتین کی زندگی کے ہر سطح پر غذائیت کی ضروریات کو پورا کرنے پر توجہ دی جائے۔ نوعمر لڑکیوں، حاملہ اور دودھ پلانے والی ماؤں، اور نوزائیدہ بچوں اور بچوں کی صحت کے مابین گہرے روابط کی وجہ سے یہ نہایت ضروری ہے۔ خاص طور پر حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین میں غذائیت کی کمی کے مسائل سے

نمٹنے کے لیے خاص طور پر کوششیں کی جائیں کیونکہ اس سے بیماری اور معذوری کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

مناسب حکمت عملی کے ذریعے غذائیت سے متعلق معاملات میں لڑکیوں اور خواتین کے گھروں میں تفریق ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ غذائیت کی تعلیم گھروں میں تغذیہ میں عدم مساوات اور حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کی خصوصی ضرورتوں کے مسائل کو دور کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال ہوگی۔ نظام کی منصوبہ بندی، دیکھ بھال اور فراہمی میں خواتین کی شرکت کو بھی یقینی بنایا جائے گا۔

پینے کا پانی اور صفائی:

گھروں خصوصاً دیہی علاقوں اور شہری کچی آبادیوں میں پینے کے صاف پانی، گندے پانی کی نکاسی، بیت الخلا کی سہولیات اور صفائی ستھرائی کی سہولیات کو آسانی سے پہنچانے میں خواتین کی ضروریات پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ ایسی خدمات کی منصوبہ بندی، ترسیل اور دیکھ بھال میں خواتین کی شراکت کو یقینی بنانے کی بات کی گئی ہے۔ اس کے تحت حکومت نے کھلے میں رفع حاجت کو ختم کرنے کے لیے بیت الخلا کی اسکیم شروع کی ہے۔

رہائش اور پناہ گاہ:

دیہی اور شہری دونوں علاقوں میں رہائشی پالیسیوں، رہائشی کالونیوں کی منصوبہ بندی اور دیہی اور شہری دونوں علاقوں میں پناہ کی فراہمی میں خواتین کے مفادات شامل ہوں گے۔ خواتین کے لیے ضروری اور محفوظ گھروں اور رہائش فراہم کرنے پر خصوصی توجہ دی جائے گی، جن میں سنگل خواتین، گھریلو سربراہان، ملازمت کرنے والی خواتین، طلبا، تربیت یافتہ اور تربیت دینے والے شامل ہیں۔

ماحولیات:

خواتین کو ماحولیاتی تحفظ اور تزئین و آرائش سے متعلق پالیسیوں اور پروگراموں میں شامل کیا جائے گا۔ ماحولیاتی عوامل کے ان کی معاش پر پڑنے والے اثرات پر غور کرتے ہوئے، ماحولیات کے تحفظ اور ماحولیات کے مضر اثرات کو قابو کرنے میں خواتین کی شرکت کو یقینی بنایا جائے گا۔ دیہی خواتین کی اکثریت آج بھی گاؤں میں دستیاب توانائی جیسے جانوروں کے گوبر، بقیہ فصلوں کے باقیات اور لکڑی کے ایندھن کے غیر تجارتی ذرائع پر انحصار کرتی ہے۔ ان ذرائع کا ماحول کے مطابق دوستانہ طریقے سے موثر استعمال یقینی بنانے کے لیے اس پالیسی کا مقصد غیر روایتی توانائی کے ذرائع کے پروگراموں کو فروغ دینا ہوگا۔ خواتین کو شمسی توانائی، بایوگیس، دھواں دار چولھا اور دیہی وسائل کے استعمال کو فروغ دینے میں شامل کیا جائے گا تاکہ ماحولیاتی نظام کو متاثر کرنے اور دیہی خواتین کے طرز زندگی کو بدلنے اور بہتر کرنے میں ان کے واضح اور موثر اثرات مرتب ہوسکیں۔

سائنس اور ٹکنالوجی:

خواتین کو سائنس اور ٹکنالوجی میں زیادہ سے زیادہ شامل کرنے کے لیے پروگراموں کو بہتر کیا جائے گا۔ ان اقدامات میں لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کا انتخاب کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کرنا اور یہ بھی یقینی بنانا ہے کہ خواتین سائنسی اور تکنیکی معلومات کے حامل ترقیاتی منصوبوں میں مکمل طور پر شامل ہیں۔ سائنسی سمجھ اور بیداری کو فروغ دینے کی کوششوں میں مزید اضافہ کیا جائے گا۔ مواصلات اور انفارمیشن ٹکنالوجی جیسے شعبوں میں ان کی تربیت کے لیے خصوصی اقدامات اٹھائے جائیں گے۔ خواتین کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مناسب ٹکنالوجی تیار کرنے کی کوششوں پر بھی خصوصی توجہ دی جائے گی اور ساتھ ہی ان پر سے سخت محنت کے بوجھ کو بھی کم کیا جائے گا۔

پریشان حال خواتین:

ان کے حالات میں بہتری اور خصوصی طور پر پسماندہ خواتین کی ضروریات کو تسلیم کرتے ہوئے خصوصی مدد فراہم کرنے کے لیے پروگرام شروع کیے جائیں گے۔ ان گروہوں میں، انتہائی غربت میں زندگی گزارنے والی خواتین، بے سہارا خواتین، ٹکراؤ کی صورت میں زندگی گزارنے والی خواتین، قدرتی آفات سے متاثرہ خواتین، کم ترقی یافتہ علاقوں میں رہنے والی خواتین، معذور بیوہ خواتین اور بزرگ خواتین، سنگین حالات میں رہنے والی اکیلی خواتین، خاندانی سربراہ خواتین، ملازمت سے بے گھر ہونے والی خواتین، مہاجر خواتین، ازدواجی تشدد کا نشانہ بننے والی خواتین شامل ہیں۔

خواتین کے خلاف تشدد:

خواتین کے خلاف ہر طرح کے تشدد، چاہے وہ جسمانی ہو یا ذہنی، ملکی سطح پر ہو یا معاشرتی سطح پر موثر طریقے سے نمٹا جائے گا تاکہ آئندہ اس طرح کے واقعات پیش نہ آئیں۔ کام کی جگہ پر جنسی ہراسانی سمیت تشدد اور جہیز جیسے طریقوں کی روک تھام کے لیے میکانزم اور اسکیمیں بنائی جائیں گی، تشدد کا نشانہ بننے والی خواتین کی دیکھ بھال اور اس طرح کے تشدد کے مرتکب افراد کے خلاف موثر کارروائی عمل میں لانا۔ خواتین اور لڑکیوں کی اسمگلنگ سے نمٹنے کے لیے پروگراموں اور اقدامات پر بھی خصوصی زور دیا جائے گا۔

لڑکیوں کے حقوق:

گھر کے اندر اور باہر، بچاؤ اور سخت دونوں طرح کے سخت اقدامات اپناتے ہوئے لڑکیوں کے ساتھ ہر قسم کے امتیازی سلوک اور ان کے حقوق کی خلاف ورزی کو دور کیا جائے گا۔ یہ خاص طور پر قبل از پیدائش سے متعلق جنس انتخاب کے خلاف بنائے گئے قوانین کو سختی سے نافذ کرنے اور شکم میں بچیوں کے قتل، بچپن میں لڑکیوں کی ہلاکت، بچوں کی شادی، بچوں سے زیادتی اور بچوں کے جسم فروشی وغیرہ سے متعلق ہوں گے۔ خاندان کے اندر اور باہر لڑکیوں کے ساتھ برتاؤ کے خاتمے اور لڑکیوں کی اچھی شبیہ پیش کرنے کے کام کو فروغ دیا جائے گا۔ لڑکیوں کی ضروریات اور خوراک وغذائیت، صحت اور تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم سے وابستہ علاقوں میں خاطر خواہ سرمایہ کاری کی ضرورت پر خصوصی زور دیا جائے گا۔

میڈیا:

میڈیا لڑکیوں اور خواتین کی انسانی شناخت سے متعلق ایک تصویر پیش کرنے کے لیے استعمال ہوگا۔ یہ پالیسی خاص طور پر خواتین کے وقار کو کم کرنے اور اسے خراب کرنے اور خواتین کے خلاف دقیانوسی تصورات اور تشدد کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔ نجی شعبے کے شراکت داروں اور میڈیا نیٹ ورکس کو خواتین کی بالخصوص معلومات اور مواصلاتی ٹکنالوجی کے میدان میں برابری کی رسائی کو یقینی بنانے کے لیے ہر سطح پر شامل کیا جائے گا۔ صنفی تفریق کے تصورات کو دور کرنے اور خواتین اور مردوں کے توازن کو فروغ دینے کے لیے ضابطہ اخلاق، کاروباری رہنما خطوط اور دیگر خود ضابطہ طریقہ کار تیار کرنے کے لیے میڈیا کے ذریعہ حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔

خواتین کو با اختیار بنانے کے معاملے میں ہندوستان کی صورتحال کئی معنوں میں بالکل مختلف ہے۔ یہاں گرام پنچایتوں کی ایک تہائی نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔ ریاستی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں بھی خواتین کے لیے نشستیں مخصوص کرنے کی باتیں کافی عرصہ سے کی جارہی ہیں۔ یہاں عملی میدان میں حکومتوں کی سردمہری ہی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کو با اختیار بنانے کے لیے کیے گئے اقدامات عام طور پر دیہی خواتین کے سماجی ومعاشی ڈھانچے میں خاطر خواہ تبدیلی نہیں لا سکے ہیں۔ خواتین کے تعلق سے نہ تو معاشی اصلاحات اور نہ ہی پالیسی کی سطح پر بہت غیر واضح ہیں اور بیشتر خواتین کے ساتھ بھی میدانوں میں حق تلفی نظر آتی ہے۔ دیہی سماجی ومعاشی ڈھانچے میں اب بھی مردوں کا دباؤ ہے۔ صحت اور تغذیہ کا مسئلہ بھی پہلے کی طرح ہے جبکہ خواتین پورے گھر کے لیے کھانا پکاتی ہیں، لیکن وہ بھوکی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں خواتین کے غذائی قلت کے زیادہ واقعات ہیں۔

عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور گینگ ریپ جیسے واقعات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ واقعات اب روز کا معمول بنتے جارہے ہیں۔ اس درندگی سے معصوم بچیاں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ آج کے جدید دور میں بھی خواتین غیرت کے نام پر قتل کی جارہی ہیں۔ آج بھی عورتوں میں بنیادی تعلیم کا فقدان ہے۔ ان کی صحت اور معاشرتی تربیت کا کوئی باقاعدہ بندوبست موجود نہیں۔ اس لیے خواتین کے تعلق سے بڑے بڑے دعوے کیے جاتے ہیں۔ جبکہ حقائق برعکس ہوتے ہیں۔ آج بھی جہیز کی خاطر جلا کر مارنے کے واقعات روز ہوتے ہیں اور ایسی گھناؤنی حرکت کرنے والے چند دن کی قید کے بعد آزاد ہو جاتے ہیں اور دھیرے دھیرے سماج ومعاشرہ انھیں بھول جاتا ہے۔ آج بھی عورتوں کو کسی مرد کی غلامی میں دے دیا جاتا ہے۔ عقد کے نام پر آج بھی عورت کو حقیر اور کمتر سمجھا جاتا ہے، راہ چلتے عورتوں پر فقرے کسنا، مذاق اڑانا، سوشل میڈیا پر ان کی تصاویر جاری کرنا، انہیں بلیک میل کرنا اور غیر اخلاقی الفاظ کا استعمال کرنا، روز کا معمول بن چکا ہے۔

آج کل این جی اوز خواتین کے حقوق اور حقوق نسواں کے نام پر ہر دوسرے دن بڑے بڑے ہوٹلز میں سیمینار اور ورک شاپ کے نام پر فنڈ زجمع کر کے مالا مال ہو رہے ہیں اور غریب اور ظلم سے پسی خواتین کو اپنے مقاصد اور شہرت کمانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کوئی این جی او صحیح معنوں میں خواتین کے حقوق کے لیے کام نہیں کر رہا ہے کہ جس سے باقاعدہ ہمارے معاشرے میں کوئی بہتری آئے۔ لفاظیوں، ریلیوں اور سیمیناروں سے کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، معاشرے میں خواتین کے مقام کی اہمیت کو کھلے دل کھلے ذہن سے تسلیم کرنا ہوگا، ان جاہلانہ رسم ورواج کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا ہوگا۔ حکومت کو سنجیدگی سے قانون بنانے کے ساتھ ساتھ اس کے نفاذ کو سو فیصد یقینی بنا کر خواتین کو تحفظ دینا ہوگا۔ ورنہ صرف کوششیں ہی ہوتی رہیں گی، نتائج صفر اور دعوے کھوکھلے ہی ثابت ہوں گے۔

□□□

Masoom Zahra
Centre for Social Medicine and
Community Health
JNU
New Delhi-110007

تحریر

شہبانہ خاتون

زندگی خود ہی گناہوں کی سزا دیتی ہے!

زرینہ کے جیٹھ خالق نے اپنے چھوٹے بھائی کی بیوہ کو بلا کر کہا:

"دیکھو بی بی! ابا جان کی زندگی تک تو یہ ٹھیک تھا کہ تم اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ ان کی کفالت میں رہیں، لیکن اب چونکہ ان کا انتقال ہو چکا ہے، اس لیے تم اپنی رہائش کا کوئی اور انتظام کر لو۔"

اپنے جیٹھ کی بات سن کر زرینہ کے ہوش اڑ گئے، اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا:

"کیوں بھائی جان؟ کیا مجھ سے اور میری بیٹیوں سے کوئی غلطی ہوئی ہے جو آپ یہ بات کہہ رہے ہیں؟"

"نہیں نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔" خالق نے نہایت سنجیدگی سے کہا، "دراصل ہمارا مذہب اجازت نہیں دیتا کہ ایک جوان بیوہ اپنے جیٹھ اور جٹھانی کے ساتھ ایک گھر میں رہے، لہٰذا جتنی جلد ممکن ہو اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ!" خالق نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

بے چاری زرینہ ہکی بکی اپنی جٹھانی کی صورت دیکھتی رہی، وہ بھی اپنے میاں کی تقلید میں اٹھ کر باہر چلی گئی۔

زرینہ کے شوہر رزاق کا انتقال ہوئے دو سال گزر چکے تھے، جب اس کی جڑواں بیٹیاں تین سال کی تھیں، ایک تو شوہر کی بے وقت موت نے اسے زندہ درگور کر دیا تھا، دوسری افتاد سسر کی موت نے پوری کر دی جن کی وفات کو ابھی چالیس دن بھی نہیں گزرتے تھے کہ خالق نے اپنا رنگ دکھا دیا۔

رزاق خانگی ملازم تھا اس لیے اسے کوئی وظیفہ بھی نہیں ملتا تھا، زرینہ حیران و پریشان سوچنے لگی کہ آخر وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ ضعیف باپ کے وسائل بھی اتنے نہیں تھے کہ وہ اپنی بیٹی اور دونوں نواسیوں کی پرورش کر سکے۔

وقت کے ساتھ ساتھ جیٹھ کا دباؤ بڑھتا گیا کہ زرینہ اپنے باپ کے پاس چلی جائے، تو تنگ آ کر زرینہ نے کہا:

"ٹھیک ہے! بھائی جان چلی جاؤں گی، آپ مجھے ابا جان کے ترکہ کا حصہ دے دیں جس سے کسی طرح ہماری گزر بسر ہو جائے۔"

"تم جاہل عورتوں کا یہی تو مسئلہ ہے کہ جانتیں کچھ نہیں اور مطالبہ کرنا شروع کر دیتی ہیں"، خالق ابرو چڑھاتے ہوئے بڑی حقارت سے بولا، "جب کوئی بیٹا یا بیٹی باپ کی زندگی میں مر جاتے ہیں تو وہ اپنے باپ کے ترکہ کے بھی حقدار نہیں ہوتے۔"

جیٹھ کی بات سن کر زرینہ ششدر رہ گئی، واقعی وہ نہیں جانتی تھی کہ اسلام کا یہ قانون بھی ہوگا، وہ تو یہ سوچ کر پر امید تھی کہ اس کے سسر کی جائیداد سے اُسے بھی کچھ نہ کچھ مل جائے گا تو بیٹیوں کی پرورش کا بندوبست ہو جائے گا۔

"میری بات پر یقین نہ آتا ہو تو جاؤ کسی عالم دین سے پوچھ لو۔" خالق نے نہایت سختی سے کہا۔

"آپ کی بات درست ہوگی، لیکن میں نے کئی یتیم بچوں کو اپنے

تایا کی سرپرستی میں پلتے دیکھا ہے، گھر بھر کی خدمت کے عوض میں بھی دو روٹی کھالوں گی۔'' زرینہ نے نہایت ملتجی نظروں سے جیٹھ کو دیکھتے ہوئے کہا، اس کے چہرے سے بے چارگی نمایاں تھی۔

''میں نے بھی بیوہ بیٹی اور یتیم نواسیوں کو نانا کے گھر میں پلتے ہوئے دیکھا ہے، بہتر ہے تم بغیر حیل وحجت کیے چلی جاؤ! ورنہ مجھے سختی سے کام لینا پڑے گا۔'' خالق حسب عادت اپنی بات سنا کر باہر چلا گیا۔

بے چاری زرینہ رات بھر جاگتی رہی، اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، کہاں جائے؟ وہ ایک غریب گھر کی خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی تھی، اس کا باپ ایک سیٹھ کی گاڑی چلاتا تھا؛ جہاں کسی تقریب میں اس کے سسر نے اسے دیکھا اور اپنے چھوٹے بیٹے رزاق کے لیے پسند کرلیا، رزاق تو باپ کی رضا میں راضی تھا، لیکن خالق نے خوب دھوم مچائی کہ ایک ڈرائیور کی بیٹی کو آپ کیسے اپنے گھر کی بہو بنائیں گے؟ ہمارے اور ان کے معیار زندگی میں دنیا جہاں کا فرق ہے، ہم رزاق کا کسی امیر گھر کی بیٹی سے رشتہ طے کریں گے، جہاں سے ہمیں قیمتی جہیز اور کئی لاکھ نقدی ملے گی، جس سے ہمارا موقف اور مضبوط ہوجائے گا۔

رزاق کے معاملہ میں یوسف صاحب نے خالق کی ایک نہیں سنی اور زرینہ کو بیاہ کر اپنے گھر لے آئے، اسے حسب حیثیت مراعات دیں اور اسے دل وجان سے قبول کیا، زرینہ کے والد کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی کہ ان کی تنگدستی کے باوجود ان کی بیٹی ایک مالدار گھر کی بہو بن چکی تھی، زرینہ کو ایک ساتھ دو بیٹیاں ہوئیں تو خالق کو زہر اگلنے کا موقع مل گیا، اسے اپنے تین بچوں کے باپ ہونے پر بڑا غرور تھا، رزاق اور یوسف صاحب نے خدا کی دی ہوئی اس نعمت کو بڑی فراخ دلی سے قبول کیا اور کہا کہ یہ تو خدا کی رحمت ہے، جسے پا کر ہم دونوں بہت خوش ہیں، یوسف صاحب کو کیا پتہ تھا کہ ان کے گھر رحمت بن کر آنے والی پوتیوں کے نصیب میں رزاق کی موت مصیبت بن کر آئے گی۔

دوسرے دن زرینہ اور اس کی بچیاں ناشتے سے فارغ ہونے بھی نہیں پائی تھیں کہ خالق زرینہ کے ابو کو لے کر آگیا، راستہ بھر پتہ نہیں انھیں کیا کچھ کہتے آیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی اور نواسیوں کو دیکھ کر رونے لگے۔

خالق نے زرینہ سے کہا: ''تمھارے ابو تمھیں لینے آئے ہیں، چلو جلدی سے تیاری کرلو۔''

خالق کی بات سن کر زرینہ کے ابو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑی منت سے کہا:

''میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، میرے بعد زرینہ اور اس کی بچیاں کس کے سہارے جئیں گی؟ انھیں اپنی سرپرستی میں رکھئے تو میں چین سے مرسکوں گا۔''

خالق نے ان ضعیف بزرگ کی ایک نہ سنی اور انھیں گھر سے رخصت کرکے ہی دم لیا۔

خاندان بھر میں جب یہ خبر عام ہوئی تو خالق کے اپنے رشتہ داروں نے خوب اس کی ہجو کی اور کہا: ''چلو! وہ لوگ ترکہ کے حقدار نہ ہوں؛ لیکن اپنے بھائی کی بیوہ اور اس کے یتیم بچوں کی پرورش کرنا بڑے اجر وثواب کا مستحق ہے، جس کی اسلام میں بڑی تاکید کی گئی ہے،'' لیکن جس کی آنکھوں پر حرص ولالچ کی پٹی بندھی ہو اور دل سیاہ ہو چکا ہو وہ کسی کا کہا کب سنتے ہیں۔

اپنی بیٹی اور نواسیوں کو لے کر جب زرینہ کے ابو گھر پہنچے تو ان کی آدھی جان بھی جاتی رہی جو اپنے داماد کی موت کے بعد ان میں باقی بچی تھی۔

خاندان اور محلے کے خیرخواہ لوگ دو دو چار چار کا گروپ بنا کر خالق کے گھر جاتے اسے سمجھانے کی بڑی کوشش کرتے لیکن سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔

دن تو سب کے گزر جاتے ہیں، چاہے سکھ کے ہوں یا دکھ کے، زرینہ نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کیا اور ساتھ میں سلائی بھی کرنے لگی، اس نے اپنی بچیوں کو گورنمنٹ اسکول میں داخل کروادیا جہاں فیس برائے نام تھی، دوپہر کے کھانے کا مفت انتظام تھا، چھوٹا سا سہی لیکن ذاتی گھر تھا، باپ گرچہ بوڑھے اور کمزور ہوچکے تھے لیکن ان کی سرپرستی میں ان تینوں کو بڑا تحفظ حاصل تھا، زرینہ دن رات ان کی خدمت کرتی جس کے عوض وہ اسے اور اس کی بچیوں کو اتنی بے لوث دعائیں دیتے جو ایک دولت مند باپ کے لاکھوں روپے خرچ کرنے سے زیادہ قیمتی اور انمول ہوتیں۔

ریشماں اور افشاں جوں جوں بڑی ہوتی گئیں انھیں اپنی ماں کی مشقت اور قربانیوں کا احساس ہونے لگا، اسکول میں ان کی رحمدل معلمات ان کے حالات جاننے کے بعد ان کی تعلیم پر کم اور ان کی کردار سازی پر زیادہ محنت کرتیں، جس کے نتیجہ میں وہ دونوں ہونہار اور ذہین طالبات بن کر ابھرنے لگیں۔

زرینہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی جس کا اسے ہمیشہ دکھ ہوتا کہ اگر آج وہ تعلیم یافتہ ہوتی تو کہیں موزوں ملازمت کرکے اپنی بیٹیوں کی مناسب پرورش کرپاتی، اپنی اسی محرومی کا احساس دلا کر وہ ریشماں اور افشاں کو سخت

پل اور ہر لمحہ خدا کا شکرادا کرتی کہ اس نے اس کا دامن انمول موتیوں سے بھر دیا ہے۔

ریشماں اور افشاں نے اللہ کی بخشی ہوئی اس نعمت غیر مترقبہ کی خوب قدر کی، اپنی طالبات کی تدریس میں دن رات ایک کردیے، اپنی دلچسپی اور اپنی معلمات کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی طالبات اور ان کے والدین کے دلوں میں خاصی جگہ بنالی جوان کے تایا کی زبردستی چھینی ہوئی لاکھوں کی جائیداد سے زیادہ قیمتی تھی۔

پچھلے پندرہ سالوں میں خالق نے ایک بار بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ماں بیٹیوں کے کیا حال ہیں، زندہ بھی ہیں یا نہیں، باپ کی پوری جائیداد پر قبضہ کرنے کے بعد بڑی ٹھاٹ سے زندگی گزاری، اپنے بیٹوں کوشہر کے سب سے معیاری اسکول اور کالج میں محنت سے پڑھائی کرکے اپنی تنگدستی کا مقابلہ کرنے کے لیے بہتر روزگار حاصل کرنے کی ترغیب دیتی، محدود آمدنی میں اس نے بڑی محنت اور جدوجہد سے اپنی بیٹیوں کو انٹر پڑھایا، پھران کے اسکول کی معلمات کے مشورے و رہنمائی سے دونوں کو D.ed میں داخل کرادیا۔

D.ed کا نتیجہ آتے آتے الیکشن کے دن قریب آگئے، اگلے پانچ سال تک اپنے عہدے کی بقا کے لیے پرائم منسٹر نے اردو میڈیم مدارس میں غیر محدود جائیدادوں کے تقرر کی منظوری دے دی، خوش قسمتی سے اعزازی کامیابی کی وجہ سے زرینہ کی دونوں بیٹیوں کا تقرر شہر کے سرکاری مدارس میں بطور معلمات ہوگیا۔

جہادِ مسلسل میں کامیابی اور کامرانی حاصل کرنے والے غازی کو جو خوشی اور فخر محسوس ہوتا ہے کچھ ایسی ہی خوشی اور انبساط زرینہ نے بھی محسوس کیا، مجاہد کا رتبہ پانا اور پھر جیت سے ہمکنار ہونا، کس قدر اعزاز کی بات ہوتی ہے یہ وہی محسوس کرسکتے ہیں جو اس جہدِ مسلسل سے کامیاب لوٹے ہوں۔

زرینہ کا دل چاہتا کہ وہ اپنے جیٹھ کو ان گنت دعائیں دے؛ کیونکہ اگر وہ اسے اور اس کی بچیوں کو زبردستی گھر سے نکال باہر نہ کرتے تو اس کی بیٹیوں کو یہ مقام کہاں سے ملتا، اسے قدم قدم پر اپنے جیٹھ کی جانب سے کی گئی تحقیر اور توہین یاد آتی تھی جس کی وجہ سے اس کے حوصلوں کو جلا ملتی رہی، ان کی سرپرستی میں رہتے تو ڈر اور خوف سے جیتے، یوں سر اٹھا کر جینا شاید ان کے نصیب میں نہ ہوتا، بیٹیوں کے مسرور اور مطمئن چہرے دیکھ کر وہ ہر

”زرینہ کا دل چاہتا کہ وہ اپنے جیٹھ کو ان گنت دعائیں دے؛ کیونکہ اگر وہ اسے اور اس کی بچیوں کو زبردستی گھر سے نکال باہر نہ کرتے تو اس کی بیٹیوں کو یہ مقام کہاں سے ملتا، اسے قدم قدم پر اپنے جیٹھ کی جانب سے کی گئی تحقیر اور توہین یاد آتی تھی جس کی وجہ سے اس کے حوصلوں کو جلا ملتی رہی ، ان کی سرپرستی میں رہتے تو ڈر اور خوف سے جیتے ، یوں سر اٹھا کر جینا شاید ان کے نصیب میں نہ ہوتا، بیٹیوں کے مسرور اور مطمئن چہرے دیکھ کر وہ ہر پل اور ہر لمحہ خدا کا شکر ادا کرتی کہ اس نے اس کا دامن انمول موتیوں سے بھر دیا ہے“

پڑھایا، لیکن ان کا نتیجہ اس قابل نہیں تھا کہ انھیں کسی اچھے کالج میں داخلہ ملتا، لہٰذا انھوں نے لاکھوں روپے رشوت دے کر انجینئرنگ کالج میں داخلہ دلایا، بڑا بیٹا باپ کے لاڈ پیار اور روپیوں کی ریل پیل کے باعث ضدی اور خودسر بن گیا، کالج چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا، باپ نے اُسے روزگار سے لگانے کے لیے شہر کے سب سے زیادہ مصروف علاقہ میں الیکٹرانک آیٹم کی دکان کھول کر دی، لیکن بیٹے نے اس میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں لی اور یوں دکان مال سے خالی ہوتی چلی گئی اور سر پر قرضوں کا بوجھ بڑھتا گیا، مجبوراً دکان بند کرنی پڑی۔

"ایک دن خالق صبح صبح زرینہ کے گھر پہنچ گیا، ریشماں اور افشاں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا، ایک بے بس اور مجبور عورت کی تربیت پاکر اس کی بیٹیاں اتنی سگھڑ اور باتمیز ہو جائیں گی؛ یہ تو اسے خیال بھی نہیں آیا تھا، اس نے بڑے پیار اور محبت سے اپنی بھتیجیوں سے بات چیت کی، زرینہ کی بھی خوب پذیرائی کی اور واپس ہوتے ہوئے دبے لفظوں میں اپنی بھاوج کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا"

انجینئرنگ کالج میں داخلہ ملنے کے بعد خالق کے دونوں بیٹے پڑھائی سے یوں لاپرواہ ہوگئے جیسے انھوں نے تعلیم کا آغاز نہیں کیا ہو، بلکہ تعلیم کی تکمیل کرلی ہو، ہر سال پانچ چھ مضامین کے بیک لاک ان کا راستہ روکے کھڑے رہتے، اس طرح انھوں نے چار سال کا کورس چھ سال میں پورا کیا۔

کالج سے فارغ ہوتے ہوتے ہر گلی اور محلے میں انجینئرنگ کالج کھل گئے تھے جہاں سے طلبا کو ڈگری تو مل جاتی لیکن روزگار کا فقدان تھا، ضرورت مند آٹھ دس ہزار روپیوں میں کام کرتے نظر آتے تھے یا پھر باہر جانے کے خواہش مند تجربہ کی خاطر اسی تنخواہ پر ملازمت کرتے تھے، خالق کے دونوں بیٹے اتنی کم تنخواہ پر کام کرنے پر راضی نہ ہوئے، انھیں تو گھر بیٹھے بیٹھے اس سے زیادہ رقم اپنے باپ سے جیب خرچ کرکے نام پر مل جاتی تھی، اتنی تنخواہ پر تو وہ لوگ کام کرتے ہیں جنھیں گھر چلانے کی ذمہ داری ہوتی ہے یا جنھیں اپنی زندگی میں جدوجہد کرکے ایک خاص مقام تک پہنچنے کی لگن ہوتی ہے۔

خالق کی پنشن کے دن قریب آرہے تھے، بے ایمانی سے بچائی ہوئی جائیداد بھی بیٹوں کی بے روزگاری اور شاہ خرچی کی نذر ہوگئی، ریشماں اور افشاں کے سرکاری ملازم ہونے کی اطلاع ملی تو اس کے لالچی دل میں یہ خیال آیا کہ اگر اس کے دونوں بیٹوں کی شادی ان سے ہو جائے تو ان کے لیے زندگی بھر کے لیے مالی تحفظ کا انتظام ہو جائے گا۔

ایک دن خالق صبح صبح زرینہ کے گھر پہنچ گیا، ریشماں اور افشاں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا، ایک بے بس اور مجبور عورت کی تربیت پاکر اس کی بیٹیاں اتنی سگھڑ اور باتمیز ہو جائیں گی؛ یہ تو اسے خیال بھی نہیں آیا تھا، اس نے بڑے پیار اور محبت سے اپنی بھتیجیوں سے بات چیت کی، زرینہ کی بھی خوب پذیرائی کی اور واپس ہوتے ہوئے دبے لفظوں میں اپنی بھاوج کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا۔

دوسری بار جب ان کے گھر گیا تو صاف صاف الفاظ میں کہنے لگا:

"اب تک جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ اور مجھے معاف کردو! میں تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں، میرے دونوں انجینئر بیٹوں کو اپنی فرزندی میں قبول کرلو۔"

زرینہ اپنے لالچی اور منافق جیٹھ کی بات سن کر سمجھ گئی کہ وہ اپنے بے روزگار بیٹوں کا اس کی برسرروزگار بیٹیوں سے کیوں رشتے کا خواہش مند ہے، کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے بڑے حوصلے اور سمجھ داری سے جواب دیا:

"نہیں بھائی جان! میری غریب بچیاں آپ کے عالی شان گھر کی بہوئیں بننے کے کہاں قابل ہیں، انھیں تو اپنی ہی طرح کسی غریب گھرانے کے بیٹوں سے شادی کرکے اپنا گھر بسانا ہے؛ تاکہ امیری اور غریبی کے فرق کی تلوار زندگی بھر ان کے سروں پر لٹکتی نہ رہے، آپ میری بچیوں کو بخش دیں تو آپ کا بڑا احسان ہوگا۔"

□□□

Shahana Khatoon

8-1-21/9

Surya Nagar

Tolichowki

Hyderabad-500008 (Telangana State)

روبینہ ساگر روبی

حسرتوں کی قبر پر

سمندر پر بکھری سنہری دھوپ آفتاب کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی اور شام اپنا آنچل پھیلانے کو بے تاب تھی۔ باغوں میں گونجتی کوئل کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔ چہچہاتے منڈلاتے پرندے واپسی کے سفر پر رواں دواں تھے۔ تیزی سے چلتی سرد ہوائیں اٹکھیلیاں کھاتی ہوئی اس کی کھلی زلفوں کو چھو کر گزر رہی تھی، ساحل کی ٹھنڈی گیلی ریت پر چل چل کر اس کے پاؤں اب تھکنے لگے تھے تقریباً ایک گھنٹے سے وہ یونہی ٹہل ٹہل کر پائلٹ نافل ارتاش Pilot Nafil Artash کی شپ کے آنے کا انتظار کر رہی تھی اور اس کی نگاہ سامنے پھیلے گہرے سمندر پر تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا، ان میں چلتی بڑی بڑی کشتیاں اور پہاڑ کی مانند نظر آتے جہاز مسافروں سے بھرے اپنے سفر پر گامزن تھے، لیکن اس کا جہاز ابھی تک نہیں آیا تھا، اس نے مایوسی سے ایک نگاہ کلائی پر بندھی واچ پر ڈالی تھی، یہ خوبصوت سنہری واچ اسے اسی پرنس (سمندری شہزادہ) نے یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے پر گفٹ کی تھی جسے وہ اپنی کلائی سے کبھی جدا نہیں کرتی تھیں، وہ اپنے دل کی کتاب پر نافل ارتاش کا نام لکھ چکی تھی لیکن شاید اس سمندری شہزادے کے دل کے ورق پر کسی اور کے نام کی تحریر تھی، تبھی تو وہ اس سے اتنا فاصلہ بنائے ہوئے تھا، اسے نظر انداز کر کے اس سے دور بھاگتا تھا، اسے کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھتا تھا اور اس کی حسرت حسرت ہی رہ جاتی تھی، لیکن جانے کیوں پھر بھی نبراس مرزا Nabras Mirza کو لگتا تھا کہ کہیں نہ کہیں اس براؤن آنکھوں والے سی پرنس کے دل میں اس کی محبت کا ایک ننھا سا دیا روشن ہے کیونکہ اس کی سمندر جیسی آنکھوں میں اسے اپنا آپ نظر آتا تھا یہ الگ بات کہ اس مغرور شہزادے نے اس پر اپنی چاہت ظاہر نہیں ہونے دی تھی، وہ جو سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی، سر پٹختی موجوں کے شور اور اردگرد کھڑی لوگوں کی آواز پر چونکی تھی اور تھک کر گھر کی طرف جانے والے راستے پر قدم بڑھا دیے تھے۔ 'نبراس ولا'' سمندر کے قریب ہی بنا ہوا تھا، جہاں ٹیرس پر کھڑے ہو کر وہ سمندر کا نظارہ کرتی تھی۔

آسمان کے کنارے سرخ ہو رہے تھے، شام سمندر کے پانی میں دم لے رہی تھی، کناروں پر لگے قطار در قطار درختوں پر جھومتے ناچتے پرندے اپنے گھونسلوں میں چھپے اب آرام کر رہے تھے، اور ستارے اپنے راجا چاند کے ساتھ فلک پر نکل آئے تھے۔

''لیس کم ان'' وہ مصروف سا بولا تھا اور وہ نروس ہوتی ہوئی اندر چلی آئی تھی۔ کل شام سے اس سے اس کی ملاقات اب ہو رہی تھی، جیسمین کی ہوش اڑا دینے والی خوشبو سے اس کا روم مہک رہا تھا، براؤن ٹی شرٹ اور براؤن ٹراؤزر میں ملبوس قد آدم آئینے کے سامنے پائلٹ نافل ارتاش بالوں میں برش پھیر رہا تھا، شیشے میں نظر آتے نبراس کے عکس کو اگنور کرتا ہوا برش پٹخ کر پلٹا اور خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتا ہوا سامنے صوفے پر جا بیٹھا تھا، اس کے اس بے رخی بھرے انداز پر اس کے مسکراتے لب سکڑ گئے تھے اور آنکھیں بھر آئیں تھی، وہ اس کی براؤن سمندر جیسی گہری آنکھوں

میں اپنا پرانا عکس ڈھونڈتی ہی رہ گئی تھی، جن آنکھوں میں اسے اپنی تصویر نظر آتی تھی آج ان آنکھوں میں اجنبیت، بیگانگی، بے حسی دکھائی دے رہی تھی۔ جانے کیوں پھر بھی اس کا دل اس گھمنڈی، ضدی سمندری شہزادے کا دیوانہ تھا۔

''ہائے سی پرنس مجھ سے بات تو کرو اس قدر خاموش کیوں ہو، اتنے مہینوں بعد تو ہم مل رہے ہیں ویسے میں آپ کے خفا ہونے کی وجہ جانتی ہوں'' وہ ٹوٹے لہجے میں اداسی سے بولی اور اس کی اداسی کے پیچھے چھپی بے انتہا محبت کی شدت کو محسوس کر کے سرد مہری سے بولا تھا۔

''جانتی ہو تو پھر مان کیوں نہیں جاتی، کیوں انکل آنٹی کو پریشان کر رہی ہو حمدان کا پرپوزل آیا ہوا ہے آپ کے لیے اور ہم سب چاہتے ہیں کہ آپ ہاں کر دو آنٹی نے مجھے اس کا فوٹو دکھایا ہے اور وہ مجھے پسند آیا ہے انجینئر ہے اور کافی ہینڈسم بھی ہے تو پھر اسے ریجیکٹ کرنے کی وجہ جان سکتا ہوں مس مس نبراس مرزا'' وہ دانت پیستا ہوا بولا اور ایڑیوں کے بل گھوم کر قہر برساتی نظروں سے اسے گھور رہا تھا وہ اس کے اس انداز سے سہم کر ڈرتے ڈرتے بولی تھی۔ ''وجہ آپ جانتے ہیں مسٹر نافل ارتاش تو پھر مجھ سے پوچھ کیوں رہے ہو۔'' شکوہ اس کے لہجے میں در آیا تھا۔

''مجھے پتا ہے آپ کے انکار کرنے کی وجہ میں ہی ہوں، میں جانتا ہوں آپ مجھے بے پناہ چاہتی ہیں چاہت کبھی کسی سے چھپی ہوئی نہیں رہتی، لیکن میرے دل میں آپ کے لیے کوئی فیلینگز نہیں ہے، میں تو آپ کو اپنا دوست بھی نہیں سمجھتا میرا آپ سے صرف انسانیت کا رشتہ ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور یہ کبھی مت سوچنا کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اگر ایسا ہوا تو یہ میری زندگی کی سب سے بڑی بھول سب سے بڑی غلطی ہوگی۔'' سنگ دلی سے کہتے ہوئے اس نے لبوں کو کچلا تھا اور شیر کی طرح غراتا ہوا اس کے قریب آ کر چیخا تھا۔ ''مجھے میری جل پری مل گئی ہے میں سمندری باشندہ ہوں مجھے آپ جیسی حوریں پسند نہیں'' بہت بے رحمی سے اس نے نبراس کے دل کا قتل کر دیا تھا اور وہ بت بنی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ''لیکن میں آپ کی جل پری سے ایک بار ملنا چاہتی ہوں میں دیکھنا چاہتی ہوں آخر وہ لکی گرل کون ہے جس نے آپ کے دل کو تسخیر کیا ہے۔'' اس نے اپنی سسکیوں کو بمشکل روک کر پوچھا تھا۔

''جب آپ کو لگے کہ اس دھرتی پر مجھے سب سے زیادہ خود سے بھی زیادہ جو لڑکی چاہتی ہے تو سمجھ لینا وہی میری جل پری ہے اور آپ سے زیادہ مجھے کوئی چاہ ہی نہیں سکتا۔'' وہ جیسے بے خود سا بول رہا تھا بے دھیانی میں لفظ اس کے منہ سے پھسل گئے تھے۔

''مجھے پتا تھا نافل میں ہی آپ کی جل پری ہوں'' وہ اپنے سارے درد بھول کر خوشی سے بولی تھی لیکن لمحوں میں اس نے اس کی ہنسی کو پھر سے چھین لیا تھا۔

> **''پت جھڑ کی شام بجھی بجھی تھی افق پر بکھرے ستارے جھلملا رہے تھے، چاند کی دودھیا روشنی سے آسمان پر اجالا پھیلا ہوا تھا، فضاؤں نے درد کی چادر اوڑھ لی تھی۔ خاموش ویران رات میں صرف خشک پتوں کے اڑنے اور چکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ پچھلے دو گھنٹوں سے وہ یونہی مسلسل روئے جا رہی تھی اس نے جلتی آنکھوں کو زور سے رگڑا تھا تبھی اسے سنسان کوریڈور میں کسی کے قدموں کی آہٹ کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی سرگوشی بھی سنائی دی تھی اور اس کا عضو عضو سماعت بن گیا تھا وہ دم سادھے دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئی تھی۔''**

''سوری میں آپ کو کچھ غلط بول گیا شاید'' سرد لہجے میں کہتا ہوا وہ مرے مرے قدموں سے باہر نکل گیا تھا، خالی روم میں اب اس کی خوشبو رقص کر رہی تھی۔ پرائے رشتے آخر پرائے ہی ہوتے ہیں اس کا نافل ارتاش سے کوئی رشتہ نہیں تھا نہ خون کا رشتہ نہ دوستی کا ہاں اس نے اس سے دل کا رشتہ ضرور جوڑ لیا تھا اپنے دل کی ڈور کو اس بے وفا شہزادے کے دل سے باندھ لیا تھا، وہ اس کے پاپا ڈاکٹر فیض مرزا کے مرحوم جگری دوست ڈاکٹر ارتاش کا بیٹا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے پڑوسی بھی تھے اور ایک ہی ہاسپٹل میں دونوں جاب بھی کرتے تھے، ایسے ہی ایک دن ڈاکٹر ارتاش اپنی وائف کے ساتھ کسی فنکشن میں گئے ہوئے تھے اور نافل کو انھوں نے ڈاکٹر فیض مرزا کے گھر چھوڑا ہوا تھا، ڈاکٹر ارتاش اور ان کی وائف فنکشن سے گھر واپس آئے تھے تبھی روڈ ایکسیڈنٹ میں ان دونوں کی موت ہو گئی تھی اس وقت نافل صرف پانچ سال کا تھا اور

یوں ڈاکٹر فیض مرزا اور ان کی بیوی نے اس کی پرورش کی ذمہ داری بخوشی لے لی تھی۔ وہ ان کے زیر سائے دیکھتے ہی دیکھتے بڑا ہو گیا تھا اور نبراس مرزا ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ اصولوں پر جینے والے انسان تھے اور نبراس اور نافل کی تربیت بھی انھوں نے کچھ اس انداز سے کی تھی۔ وہ اندر سے جتنے نرم تھے اوپر سے اتنے ہی سخت بھی تھے ان کی کڑی محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ نافل ارتاش نیوی مرچنٹ پائلٹ (Navy Marchant Pilot) بن چکا تھا۔

پت جھڑ کی شام بجھی بجھی تھی افق پر بکھرے ستارے جھلملا رہے تھے، چاند کی دودھیا روشنی سے آسمان پر اجالا پھیلا ہوا تھا، فضاؤں نے درد کی چادر اوڑھ لی تھی۔ خاموش ویران رات میں صرف خشک پتوں کے اڑنے اور چکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ پچھلے دو گھنٹوں سے وہ یونہی مسلسل روئے جا رہی تھی اس نے جلتی آنکھوں کو زور سے رگڑا تھا تبھی اسے سنسان کوریڈور میں کسی کے قدموں کی آہٹ کے ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی سرگوشی بھی سنائی دی تھی اور اس کا عضو عضو سماعت بن گیا تھا وہ دم سادھے دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''پلیز نبراس سے شادی کر لو نافل بیٹا کیونکہ میں چاہتا ہوں میری بیٹی مجھے چھوڑ کے کہیں نہ جائے ہمیشہ میرے پاس ہی رہے مان جاؤ نا یار مان کیوں نہیں جاتے کب سے منا رہا ہوں ضدمت کرو بس اب ہاں کہہ دو۔'' ڈاکٹر فیض مرزا کی ملتجی آواز فضا میں گونجی تھی۔

''سوری انکل میں آپ کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا آپ چاہے کچھ بھی سمجھو میری نا بھی ہاں میں نہیں بدلے گی کیونکہ میری جل پری کوئی اور ہے مائی لو مائی لائف۔'' نافل ارتاش کی خوشی سے سرشار آواز اس کے کانوں میں سیسہ انڈیل رہی تھی، وہ اپنا فیصلہ سنا چکا تھا اس کا دل چلا چلا کر رو رہا تھا اس کا مسیحا ہی اسے زخم دے گیا تھا وہ زخم جس کا علاج سوائے اس کے دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں تھا۔ آج پھر خواب کی شاخ سے ایک خواہش ٹوٹ کر حسرت کی قبر میں دفن ہو گئی تھی وہ اپنی چیخوں اور سسکیوں کو دباتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی اشکوں سے تر آنکھیں بے تابی سے برس رہیں تھی۔ زندگی پل پل قیامت ڈھا رہی تھی دن رات یونہی خاموشی کی نذر ہو رہے تھے، ڈاکٹر نافل ارتاش اپنی ڈیوٹی پر واپس جا چکا تھا ڈاکٹر فیض مرزا اور اس کی ممی اس کی اجڑی حالت دیکھ کر کڑھتے رہتے اور جانے کیوں اس سے بات کرتے ہوئے نظریں چرا لیتے تھے یوں جیسے اس سے کچھ چھپا رہے ہوں۔

اندھیرا اجالے سے بچھڑ رہا تھا، آموں کے درختوں پر بیٹھی کوئل اس شاخ سے اس شاخ پر بیٹھی ساز چھیڑ رہی تھی اس کی کومل آواز میں مٹھاس کے بجائے دکھ گونج رہا تھا یا پھر اس کے وجود میں دکھ درد پھیلا ہوا تھا اس لیے اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بالکونی میں کھڑی باہر برستی رم جھم بارش کو دیکھ رہی تھی جس کی پھوار میں درخت بھیگ رہے تھے اور ڈال پہ بیٹھی وہ کوئل بھی بھیگ گئی تھی لیکن اس نے پھر بھی کوکنا نہیں چھوڑا تھا کیونکہ اسے اپنی کوک سے عشق جو تھا، نبراس مرزا کے دل کے ویران بسیرے میں نافل کی صدائیں گونج رہی تھی آج پھر وہ بے وفا سمندری شہزادہ اسے شدت سے یاد آ رہا تھا حالانکہ وہ اب کسی اور کی ہو چکی تھی وہ اپنے پاپا کو نافل کے آگے جھکا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے دل کا کشکول خالی رہنا گوارا تھا مگر بھیک میں ملی محبت قبول نہیں تھی اس لیے اس نے اپنے ممی پاپا کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے حمدان سے منگنی کر لی تھی اور بہت جلد اس کی شادی ہونے والی تھی۔

''نبراس نے مٹھیوں میں بھرا باجرہ پھینکا تو ریلنگ پر بیٹھے ڈھیروں چڑیاں اور کبوتر پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے نیچے اتر آئے تھے، مسکراتے چہچہاتے سفید کبوتروں کو دیکھ کر اس کے غمزدہ ہونٹوں پہ حسرت بھری مسکراہٹ تڑپ کر رہ گئی تھی۔''

نبراس نے مٹھیوں میں بھرا باجرہ پھینکا تو ریلنگ پر بیٹھے ڈھیروں چڑیاں اور کبوتر پروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے نیچے اتر آئے تھے، مسکراتے چہچہاتے سفید کبوتروں کو دیکھ کر اس کے غمزدہ ہونٹوں پہ حسرت بھری مسکراہٹ تڑپ کر رہ گئی تھی۔

''مت کرو ان پنچھیوں سے اتنی محبت کیونکہ یہ بے وفا ہوتے ہیں جدا ہو جائیں گے یہ ایک دن آپ سے اور آپ تنہا رہ جاؤ گی ان کا کہیں ٹھکانا نہیں ہوتا آج یہ یہاں ہیں اور کل شاید آپ سے بچھڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے میری طرح میرا بھی یہاں آج رات بھر بسیرا ہے اور پھر صبح مجھے اڑ جانا ہے۔'' مانوس سی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا تھا اس کی پشت پر کھڑا پائلٹ نافل ارتاش بے قراری سے اسے دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں کے کونے نم ہو رہے تھے وہ بہت بے چین و بے تاب نظر آ رہا تھا۔ یہاں آ کر بھی شاید وہ سکون سے ایک لمحہ بھی نہیں سویا تھا اسے آئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا اور وہ اسے اب نظر آئی تھی اس کی دنیا اجاڑ کر بکھر وہ بھی گیا تھا۔

"ان معصوم پرندوں کو بے وفا کہنے سے پہلے خود کو دیکھو کیا آپ نے میرے ساتھ بے وفائی نہیں کی نافل محبت کی ابتدا انسان کو ہنساتی ہے تو انتہا رلا دیتی ہے۔" تلخی سے کہتے ہوئے اس نے بھیگی پلکوں کو پونچھا تھا اور اٹھ کر چل دی تھی اور وہ گم صم سا اس کی پشت پر لہراتی چوٹی کو دیکھتا رہ گیا تھا محبت کے گہرے دریا میں نبراس مرزا کی وفا کے تنکے ڈوب گئے تھے۔

"نبراس بیٹا مجھے معاف کر دینا میں نے ہیرے کو ٹھکرا کر آپ کے لیے پتھر کا انتخاب کیا تھا۔ حمدان جیسا لالچی اور کم ظرف لڑکا آپ کے لائق نہیں تھا اس کی بہت ساری ڈیمانڈ تھی جسے میں پورا تو کر سکتا تھا لیکن مجھے اپنی بیٹی کا سودا منظور نہیں تھا۔ ڈاکٹر فیض مرزا اسے اپنے سینے سے لگائے رو رہے تھے اور وہ انھیں خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے حمدان سے آپ کا رشتہ توڑ دیا ہے اور اب آپ کی شادی صرف نافل کے ساتھ ہوگی کیونکہ اس کی جل پری کوئی اور نہیں آپ ہی ہو اس نے آپ کو ٹھکرایا نہیں تھا بلکہ اسے ایسا کرنے کے لیے میں نے ہی مجبور کیا تھا۔ اس رات ہم نے آپ کو کوریڈور میں کھڑا دیکھ لیا تھا اور پلان کے مطابق ہم دونوں نے ڈرامہ کیا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے یہ طعنہ دے کہ میں نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کر کے اپنے احسانوں کا بدلا لیا ہے لیکن اب مجھے لوگوں کی پرواہ نہیں ہے اب آپ دونوں کی خوشیاں زیادہ عزیز ہیں۔ وہ اس کا آنچل خوشیوں کی نوید سے بھر کر چلے گئے تھے اور وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے نہیں تھک رہی تھی نافل کے متعلق اس کے دل میں جو غلط فہمی تھی وہ دور ہو گئی تھی دکھ کے بادل چھٹ رہے تھے اور خوشی کی گھٹائیں برسنے کو بے تاب تھی۔

پائلٹ نافل ارتاش کئی دن سے سمندری سفر میں تھا، ڈاکٹر فیض مرزا نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کا وعدہ کیا تھا اور وہ ان کا وعدہ نبھانے کے لیے اپنی ڈیوٹی سے واپس آ رہا تھا اپنی جل پری نبراس مرزا کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے لیے وہ بے حد خوش تھا کیونکہ اس کی محبت نبراس اس کی ہونے جا رہی تھی۔ ساحل کنارے اس کا جہاز رکا ہوا تھا۔ مسافر فلور پر کھڑے سمندر کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ سمندر میں طوفان آ گیا تھا خوشگوار موسم اچانک تبدیل ہو گیا تھا۔ تیز ہوائیں چلنے لگی تھی، لہروں کا شور بڑھ رہا تھا اندھیرا چھا رہا تھا، چاروں طرف دھواں ہی دھواں دکھائی دینے لگا تھا، جہاز ڈولنے لگا اور پھر پائلٹ نافل ارتاش سمیت سبھی مسافر بے پناہ گہرے سمندر میں ڈوب گئے تھے، سمندر نے سی پرنس کی جان لے لی تھی نبراس مرزا کے پیار کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا تھا۔

زیست کے روتے بلکتے سسکتے لمحے آخر گزر ہی جاتے ہیں، اسی طرح موسم بھی کسی کے لیے رکتے نہیں ہیں گزرتے چلے جاتے ہیں، جانے کتنے موسم، بے شمار گھڑیاں بے شمار پل بے شمار لمحے اس کی اس سنہری گھڑی میں قید ہو چکے تھے جس کا سنہری پن ایسا ماند پڑ چکا تھا لیکن اس اسی سالہ بوڑھی خاتون کی کلائی پر بندھی وہ گھڑی آج بھی لوگوں کی نگاہوں کا مرکز تھی اس کی کمر جھک گئی تھی جھریوں بھرا تھکا ہوا چہرہ اور کمزور وجود پتھرائی ہوئی آنکھیں لوگ اسے دلچسپی سے دیکھتے تھے اور وہ ہانپتی کانپتی سمندر کنارے چھڑی کے سہارے پیدل چلتی تھی۔ اسے آج تک نافل ارتاش کی شپ کے آنے کا انتظار تھا نافل ارتاش کنارے پر کھڑا ہاتھ ہلا کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا سورج اداس سا اپنے منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سمندر میں اترتی شام رو رہی تھی، ہجر کے دریا کو پار کرتے ہوئے وہ بہت دور نکل آئی تھی۔ سمندر کنارے لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا لوگ بہت انجوائے کر رہے تھے اور اسے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور اس کی نگاہیں دور نظر آتے کشتیوں اور جہازوں پر تھی۔ اس نے تڑپ کر ایک آخری اور حیرت بھری نگاہ وسیع و عریض سمندر پر ڈالی تھی جہاں گہرے پانیوں میں کسی کی بے شمار یادیں بھٹک رہی تھیں پھر کچھ دن گزارنے کے بعد ساحل کنارے تفریح کرتے لوگوں نے اسے نہیں دیکھا تھا نبراس مرزا جانے کتنی حسرتوں کو اپنے دل میں دبائے مر چکی تھی اور اس کا وجود حسرتوں کی قبر میں دفن ہو چکا تھا۔ اس کی قبر کے قریب لگے درخت پر بیٹھے پرندے رو رہے تھے اور ان کی نگاہیں بہت دور سمندر میں نظر آتے جہازوں پر تھی۔

تم مجھے چھوڑ کے جاتے ہو کہاں رک جاؤ، میں تمنا ہوں میرا صرف مقدر تم ہو جوئے کم آب ہوں میں اور سمندر تم ہو، ہاں میری جاں میری جاں کے مسافر تم ہو ہم تمنا کے در و بام کی تعمیر کریں، اے سمندر کے ہوا روک اسے روک اسے مسافر جاں کے، اے ہوا روک اسے روک اسے روک

□□□

Rubina Sagar Rubi

D/o. Shaikh Bilal Sagar

Hirapura

Near Darus Salam

Achalpur City

Dist. Amravati-444806 (M.S)

نازیہ

غزل

اب یقیناً ختم یہ بھی سلسلہ ہو جائے گا
ہم میں تم میں اک بڑا سا فاصلہ ہو جائے گا

جو دیا کرتے تھے ہم کو حوصلہ پرواز کا
وہ بتائیں پست کیسے حوصلہ ہو جائے گا

پیار کا تھا جو پجاری ہم یقیں کیسے کریں
پیار کا وہ نام لینے سے خفا ہو جائے گا

درد کا درماں بنے گا درد خود ہی دوستو!
رفتہ رفتہ درد سے دل آشنا ہو جائے گا

اشک کا قطرہ جو میری آنکھ سے ٹپکا ہے دوست
دیکھنا اک روز یہ محشر بپا ہو جائے گا

دل تمھارا ایک دن کندن بنے گا دیکھنا
عشق کے شعلے میں تپ کر جب فنا ہو جائے گا

نفرتوں کا بیج لے کر آج ملتے ہیں ناز
دیکھنا ماحول کل تک کیا سے کیا ہو جائے گا

Nazia Parveen
W/o Arif Nasir
259-D Nayyar Manzil
Flat No. 202
Jamia Nagar, New Delhi-110025

چھولے

اشیا: ایک کپ قابلی چنے ابال لیں، دو پیاز، دو ٹماٹر باریک کاٹ لیں، ایک چمچ لہسن پسا ہوا، دو چمچ پسی سبز مرچ، سبز دھنیا، نمک حسب ضرورت، آدھا چمچ زیرہ، دارچینی ایک، دو تیز پات، دو سبز الائچی، دو چمچ چنا مصالحہ پاؤڈر، تین چمچ تیل، چوتھائی چمچ ہلدی، آدھا چمچ پاؤ بھاجی مصالحہ

ترکیب: گھی گرم کر کے لونگ، دارچینی، سبز الائچی، تیز پات اور زیرہ ڈالیں، چند سیکنڈ بعد لہسن، ادرک ڈال کر بھون لیں۔ اب پیاز اور سبز مرچیں ڈالیں اور بادامی کر لیں۔ ہلدی، نمک اور ٹماٹر ڈال کر پکائیں۔ اب چنا مصالحہ ڈالیں اور اچھی طرح ملا لیں، چنے پانی کے ساتھ ڈالیں اور پکنے دیں۔ جب پانی بالکل تھوڑا رہ جائے تو گرم مصالحہ ڈالیں اور پاؤ بھاجی مصالحہ ڈالیں۔ سبز دھنیا ڈال کر پیش کریں۔

پالک کے کباب

اشیا: ایک گٹھی پالک، 250 گرام چنے کی دال، دو چمچ کدوکش کیا پنیر، چھ سبز مرچ، دو چمچ گرم مصالحہ، پودینہ کے چند پتے، کارن فلور، بریڈ

ترکیب: پانی ابلنے کو رکھیں جب ابلنے لگے تو پالک کو اچھی طرح دھو کر اس میں ڈال دیں اور پانچ منٹ کے لیے ابال لیں۔ پانی سے پالک کو نکال لیں اور پانی پھینک دیں۔

دال کو گلا لیں بہت زیادہ نا گلنے دیں اگر پانی بچ جائے تو نکال کر پانی پھینک دیں۔ دال، پالک، گرم مصالحہ، سبز مرچ، مغز ریزے، پودینہ، نمک اور پنیر ملا کر پیس لیں۔ اس سے تھوڑا آمیزہ لے کر کارن فلور میں رکھیں اور اس کے چاروں اطراف کارن فلور لگا لیں اور دبا کر ٹکی کی شکل دے دیں اور گہرے تیل میں تل لیں۔ چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

گوبھی منچورین

اشیا: ایک پھول گوبھی کا، کاٹ لیں، دو چمچ لہسن اور ادرک پسا ہوا، ایک چمچ باریک کاٹا ہوا لہسن، دو چمچ سرخ مرچ، آدھا چمچ ہلدی کا پاؤڈر، دو چمچ سبز مرچ پسی ہوئی، آدھی گٹھی دھنیا کی باریک کاٹ لیں، دو عدد پیاز، سبز ملے تو بہتر ہے، باریک کاٹ لیں، ایک چٹکی زعفران، دودھ میں بھگو لیں، دو چمچ سویا ساس، ڈیڑھ چمچ کارن فلور، پانی میں حل کریں، ایک چمچ آٹا، آدھا کپ چاول کا آٹا، آدھی چمچ بیکنگ پاؤڈر، آدھا کپ کارن فلور، آدھا لیموں کا رس، نمک حسب ذائقہ، تیل دو چمچ

ترکیب: کسی بڑے پیالے میں آٹا، چاول کا آٹا، آدھا کپ کارن فلور، بیکنگ پاؤڈر، نمک سویا ساس، ایک چمچ لہسن ادرک، ایک چمچ سرخ مرچ، ایک چمچ سبز مرچ اور ہلدی کو پانی میں اچھی طرح ملا لیں، اب اس میں گوبھی کے ٹکڑے بھگو کر تل لیں اور پلیٹ میں نکال لیں۔

فرائی پین میں دو چمچ تیل ڈالیں اور اس میں لہسن اور ادرک کو ہلکا بادامی کر لیں۔ اس میں پیاز ڈالیں اور جونہی پیاز کا رنگ بدلنے لگے اس میں کاٹا ہوا لہسن اور باقی کی سبز مرچ ڈال کر ایک منٹ بھون لیں، سویا ساس ڈال کر بھونیں، آگ ہلکی کر کے اس میں کارن فلور پانی میں جو ملا کر رکھا تھا ڈالیں اور چمچ ہلاتے رہیں تا کہ گٹھلیاں نا پڑیں۔ اس میں زعفران یا سرخ رنگ ڈالیں۔ جب گاڑھا ہو جائے تو سبز دھنیا ڈال کر چولہے سے اتار لیں۔ پانچ منٹ بعد اس میں تلی ہوئی گوبھی کو شامل کر دیں۔

گاجر کا حلوہ

اشیا: ایک کلو گاجر، کدوکش کر لیں، چار سبز الائچی، ایک یا ڈیڑھ کپ چینی، کھویا، روح کیوڑا، آدھ کپ گھی یا تیل، آٹھ چمچ سوکھا دودھ، بادام، پستہ، کشمش یا جو کچھ بھی آپ ڈالنا چاہیں۔

ترکیب: کش کی ہوئی گاجروں کو الائچی کے ساتھ بغیر پانی ڈالے، ہلکی آنچ پر پکنے رکھ دیں، جب گاجریں گل جائیں اور ان سے نکلنے والا پانی خشک ہو جائے تو اس میں چینی ڈال دیں اور اس کا پانی بھی خشک کر لیں، اب اس میں تیل، کھویا، سوکھا دودھ اور بادام وغیرہ ڈال کر پانی مکمل خشک کر لیں اور روح کیوڑا ڈال کر گرم گرم پیش کریں یا ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

(بحوالہ www http://punjabiandpunjab.com)

شکیل احمد

کھانا پکانے سے متعلق ضروری باتیں

کھانا پکانا ایک فن ہے۔ ہمارے گھروں میں عموماً اس ہنر کی تعلیم نہیں دی جاتی اور کھانا پکانے والے اپنی نادانی سے غذا کے کئی مفید اجزا ضائع کر دیتے ہیں۔ کھانا ایسا پکانا چاہیے جو محرک اشتہا، لذیذ اور غذائیت سے پر ہو۔ اس کا اثر گھر والوں کی صحت، ہمت اور اخلاق پر پڑتا ہے۔ دوسرے کاموں کی طرح کھانا تیار کرنا ایک مکمل عمل ہے۔ لیکن اگر تدبیر سے کریں تو بہت آسان ہو جاتا ہے۔ کھانا پکانا شروع کرنے سے پہلے تمام ضروری چیزیں اور برتن مہیا کر لینا چاہیے۔ درمیان میں سامان لینے جانے سے پریشانی ہوتی ہے۔

کچھ غذائیں ہم کچی استعمال کرتے ہیں اور کچھ پکا کر کھاتے ہیں۔ دونوں ہی طرح کی غذاؤں کو پہلے صاف کر لینا چاہیے۔ پکانے سے اکثر غذاؤں میں موجود جراثیم ختم ہو جاتے ہیں لیکن کبھی کبھی جراثیم باقی بھی رہ سکتے ہیں اس لیے شروع میں ان کا دھونا اور صاف کرنا ضروری ہے۔ سبزیوں اور پھلوں کو صاف پانی سے مل کر دھونے سے ان کی سطح پر چپکے جراثیم نکل جاتے ہیں۔ بہتر ہے کہ پانی میں تھوڑا پوٹاسیم پرمینگنیٹ ڈال لیں بعد میں صاف پانی سے دھو ڈالیں۔ جڑوں والی اور ہرے پتوں کی سبزوں کو خاص طور سے صاف کر کے دھونا چاہیے۔ سبزی یا پھل بہت دیر تک پانی میں بھگو کر نہیں رکھنا چاہیے ایسا کرنے سے پانی میں حل ہونے والے بہت سے مفید اجزا جیسے وٹامن اور معدنیات وغیرہ گھل کر نکل جاتے اور ضائع ہو جاتے ہیں۔ مریضوں کو دی جانے والی پرہیزی غذاؤں کی صفائی پر خصوصی توجہ دینا چاہیے کیونکہ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے مریض کے اندر جراثیم سے مدافعت کی صلاحیت اور طاقت بہت کم ہو جاتی ہے۔

باورچی خانہ کے اصول

پرانے قسم کے باورچی خانے بغیر کسی منصوبہ کے ہوتے تھے جس کی وجہ سے وہ بند اور گھٹے گھٹے ہوتے تھے۔ ان میں تھوڑی دیر کام کرنا بھی بہت دشوار تھا۔ دھواں نکلنے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا تھا۔ دن میں بھی باورچی خانہ میں اندھیرا رہتا تھا۔ جگہ زیادہ ہونے کے باوجود وہ بہت تکلیف دہ ہوتے تھے۔ کھانا پکانے والی عورتوں اور ان کے ساتھ بچوں کی تندرستی خراب رہتی تھی۔ گھریلو عورت کا آدھے سے زیادہ وقت باورچی خانہ یا اس سے متعلق کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ اس لیے گھر میں باورچی خانہ اور اس کے اندر ضروری انتظام بہت ڈھنگ سے ہونا چاہیے۔ باورچی خانہ میں دھواں نکلنے کے لیے چھت پر چمنی، ہوا اور روشنی کے آنے کے لیے روشن دان اور کھڑکیاں ہونا چاہیے۔ باورچی خانہ خوب صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ روشنی کا خوب معقول انتظام ہونا چاہیے تاکہ کونوں کی بھی گندگی نظر آ جائے۔ چولہا رکھنے کے لیے الگ جگہ بنی ہو۔ آج کل گیس کے چولہے عام ہو رہے ہیں ان کو استعمال کرتے وقت بہت احتیاط رکھنی چاہیے۔ گیس کے سلنڈر کے قریب مٹی کا تیل۔ دیا سلائی رکھنا یا جلانا خطرناک ہے۔ سلنڈر چولہے سے دور رکھنا چاہیے۔ ماچس کو ٹین کی ڈبہ میں بند کر کے رکھنا چاہیے۔ عورتوں کو کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر پکانے کے لیے مناسب جگہ اور اسٹول یا پیڑھی ہونا چاہیے۔ کھانا پکانے برتن رکھنے کے لیے الماریاں اور اسٹینڈ کا انظام ہو تو بہتر ہے۔

باورچی خانہ کی صفائی کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ جالا نہیں لگنے دینا چاہیے۔ روز جھاڑو اور پوچھا لگانا چاہیے۔ ہفتہ میں ایک بار چھت سے

صاف کر کے فرش کو پانی سے ڈھوڈالا جائے۔ کیڑے یا چھوٹے چھوٹے insect سے باورچی خانے کو بچانا چاہیے۔ مہینے میں ایک یا دو بار D.D.T یا کوئی insecticide چھڑ کنا چاہیے۔ لیکن یہ بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ سب برتن اور کھانے پینے کی چیزوں کو وہاں سے نکال کر صفائی کرنا اور insecticide چھڑ کنا چاہیے۔ بہت سے موذی جراثیم آنتوں میں آ کر بیماریاں پیدا کرتے ہیں اس لیے باورچی خانہ میں پانی نہیں رکنے دینا چاہیے۔ کھانے کی چیزوں کو کبھی کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ برتنوں کو خوب صاف کر کے دھونا چاہیے۔ ٹوٹا، مڑا، ٹیڑھا اور نشان پڑا برتن استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ایسے برتنوں میں گندگی بھر جاتی ہے۔ اکثر جراثیم بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو جسم میں جا کر بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ ان برتنوں کا صاف کرنا بہت مشکل ہے۔ باورچی خانہ کی چھری بھی صاف ہونی چاہیے۔ اکثر لوگ چاقو کا ہتھا ٹوٹنے کے بعد اس میں کپڑا وغیرہ باندھ لیتے ہیں جس میں بہت گندگی بھرتی رہتی ہے۔ کھانا رکھنے کی جگہ جیسے نعمت خانہ وغیرہ خوب صاف ہونا چاہیے۔ بہتر ہے کہ نعمت خانہ کو ٹھنڈی اور اندھری جگہ میں رکھیں۔ اس میں ہوا آنے جانے کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔ کھانے کو مکھی، مچھر اور دوسرے کیڑوں سے بچانا چاہیے۔ جالی کے نعمت خانہ میں بھی کھانے کے برتن کو سرپوش سے ڈھک کر رکھنا چاہیے۔ نعمت خانہ کے قریب جھاڑو، پونچھا یا جھاڑن وغیرہ ہرگز نہیں رکھنا چاہیے۔

کھانا پکانا شروع کرنے اور سبزی کاٹنے سے پہلے ہاتھوں کو اچھی طرح دھو لینا چاہیے۔ ہاتھ کے ناخن کٹے ہونے چاہیے۔ کھانسی اور نزلہ کی حالت میں کھانا پکانے میں پرہیز کرنا چاہیے۔ چھینک آتے وقت ناک اور منہ پر کوئی رومال ضرور رکھ لیں۔ اگر ہاتھ میں کوئی زخم ہو تو اس پر پٹی ضرور باندھ لینا چاہیے۔ کھلے زخم پر جراثیم جمع ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو سبزی اور سلاد کاٹتے وقت ہاتھ پر دستانے پہن لینا چاہیے۔

سبزیوں کو خریدنا، رکھنا اور پکانا

بہتر ہے کہ اپنے استعمال کے لیے ہم خود گھر کے قریب سبزی بوئیں۔ اس سے روزانہ ضرورت کے وقت تازی سبزی مل جائے گی۔ لیکن عموماً یہ بات ممکن نہیں ہو پاتی اور خصوصاً شہروں میں تو بہت مشکل ہے اس لیے بازار سے تازی اور اچھی سبزی خریدنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ باسی اور سوکھی سبزیاں اپنی غذائیت کا بہت سا جز پہلے ہی کھو چکی ہوتی ہیں۔ سبزی کاٹنے کے بعد دھوپ میں رکھتے ہی اس کی کیروٹین وٹامن سی اور وٹامن بی 1 کا بیشتر حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر سائے دار جگہ میں بھی اوسط درجہ حرارت پر پالک یا بتھوا رکھ دیں تو دو دن کے اندر اس کا 50 فیصدی وٹامن سی ختم ہو جاتا ہے۔ پانی کے خشک ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وٹامن بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ سبزیوں کو رکھنے کی جگہ ریفریجریٹر ہے جہاں اس کو ٹھیک سے لپیٹ کر 34°-45° کے درمیان رکھنا چاہیے۔

سبزیوں کی صفائی کرنے میں بہت سے ضروری اجزا ضائع نہ ہو جائیں اس لیے ان اجزا کو بچانے کے لیے حتی الامکان کوئی بھی جز بلا ضرورت کاٹ کر الگ نہیں کرنا جیسے پھول گوبھی اور گانٹھ گوبھی کے نرم پتے جن میں قیمتی اجزا خصوصاً کیروٹین ہوتے ہیں استعمال کر لینا چاہیے۔ کاہو کے باہری ہرے پتوں میں کیروٹین اور اچھی پروٹین اندر کے زرد حصہ کے مقابلہ زیادہ ہوتی ہے۔ لیمو کے عرق اور سرکہ میں اسٹرک ایسڈ ہوتا ہے جو جراثیم کو ختم کرتا ہے۔ اگر ان کو کھانے کے ساتھ چٹنی یا اچار میں ملا کر کھائیں تو بہت مفید ہے۔ پیاز اور لہسن بھی دافع جراثیم ہیں۔ اس لیے سلاد میں کئی چیزیں ملا کر استعمال کی جاتی ہے۔

پھلوں کو کھانے سے پہلے دھو لینا چاہیے۔ عموماً پھلوں کو نل کے صاف پانی سے دھو لینے سے جراثیم نکل جاتے ہیں۔ بیریز (رس دار چھوٹے بیج والے پھل) باریک چھلنی میں رکھ کر اوپر سے دو یا تین بار پانی ڈال کر دھونا چاہیے۔ پھل دیکھنے میں صاف اور سوکھے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی سطح پر بہت سے جراثیم چپکے ہوتے ہیں۔

سبزی کاٹنا اور سلاد تیار کرنا

سبزی تیار کرنے میں چار باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ (1) سبزی

تازی ہو۔ بہتر ہے استعمال کرتے وقت ہی پودے سے توڑی جائے۔(2) اچھے قسم کی ہو۔ کسی طرح کا کیڑا وغیرہ نہ لگا ہو۔ مکمل طور پر مرکب کھاد میں تیار ہوتی ہو۔ سڑی اور سوکھی نہ ہو۔ خصوصاً مریضوں کی خوراک کے لیے تو بہت اعلیٰ قسم کی سبزی ہونا چاہیے۔ (3) صفائی کے بارے میں ہدایات پر عمل کیا جائے تاکہ سبزی کے کیڑوں، جراثیم اور کوئی بیلائی بیکٹریا سے پھیلنے والے امراض سے آدمی بچا رہے۔(4) کئی سبزیوں کو ملا کر سلاد بنایا جائے تاکہ ہر طرح کی غذائیت اور ضروری اجزا حاصل ہو جائیں مثلاً سلاد میں پیاز، ٹماٹر، کھیرا، مولی، ککڑی، گاجر، چقندر، شلجم، ہری مرچ، ہری پتیاں اور لیمو شامل کیے جائیں بہتر ہے کہ ایک وقت کی سلاد میں لیمو کے ساتھ کوئی تین سبزیاں شامل ہوں۔ دوسرے وقت دوسری تین اس طرح بدل بدل کر استعمال کرنے سے ذائقہ بہتر، خوش رنگ اور مفید اجزا مل جاتے ہیں۔

مختلف سبزیوں کے دھونے اور کاٹنے کے طریقے الگ ہیں۔ پتوں والی سبزیوں مثلاً کرم کلا، برگ کاہو، برگ کاسنی۔ گوبھی کے پتوں کو الگ کر کے خشک اور سڑے پتوں کو نکال دینا چاہیے۔ ہرے پتوں کو الگ الگ ہلکے نمک کے پانی سے دھونا چاہیے۔ بعد میں صاف پانی سے دھو کر لوہے کی جالی یا ٹرے میں رکھ کر اس کا پانی نچوڑنا چاہیے۔ چھوٹی پتیوں والی سبزیاں جیسے پالک، بتھوا، کلروندا، چار اور کونپل وغیرہ کے سخت ڈنٹھل اور جڑیں نکال کر نمک کے پانی میں بھگو دینا چاہیے بعد میں خوب دھونا چاہیے۔

جڑ والی سبزیوں جیسے گاجر، چقندر، مولی، گانٹھ گوبھی، اجمود، زمین قند کو بہتے پانی کے نیچے رکھ کر برش سے رگڑ کر دھو ڈالنا چاہیے۔ پھر کاٹ کر نمک اور لیمو کے پانی میں ڈال دینا چاہیے تاکہ تازگی باقی رہے۔

بیج والی سبزیوں جیسے ٹماٹر، کھیرا، ککڑی، کدو، ہری مرچ وغیرہ کو دھو کر اگر ضرورت ہو تو چھیل کر چھوٹے ٹکڑے کر لینا چاہیے۔ کھیرے کو درمیان سے سروں کی طرف چھیلنا چاہیے پھر کڑوے سروں کو کاٹ کر نکال دینا چاہیے۔ نرم کھیرے اور ککڑی کو چھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سبزیوں کو کاٹ کر نمک اور لیموں کے پانی میں بھگو دینے سے مضر جراثیم ختم ہو جاتے ہیں اور تازگی برقرار رہتی ہے۔ بعد میں بہتے صاف پانی سے جالی میں رکھ کر دھو دینا چاہیے اس سے وہ بالکل صاف ہو جائے گی۔ جراثیم وغیرہ سبزی اور پھلوں کے باہری سطح پر ہوتے ہیں اندرونی حصہ بالکل صاف ہوتا ہے۔ جڑوں والی سبزیوں کو جالی دار برتن میں رکھ کر ابلتے پانی میں ایک غوطہ دینے سے بھی جراثیم نکل جاتے ہیں اور سبزی بالکل محفوظ رہتی ہے۔

سبزیوں اور پھلوں کے عرق جراثیم سے بالکل پاک ہوتے ہیں۔ بہتر ہے کہ عرق میں تھوڑا سا لیموں کا عرق بھی شامل کر دیا جائے۔

ایسا سے پیدا ہونے والے متعدی مرض سے بچنے کے لیے سبزیوں کو چونے کے پانی اور کلورائڈ میں ڈبو دینا چاہیے پھر ابلتے پانی سے دھو لینا چاہیے تاکہ چونا نکل جائے۔

آلو کے کچالو بنانے میں احتیاط

ہمارے ملک میں آلو کے کچالو کا عام رواج ہے۔ آلو ابال کر رکھنے کے بعد اس میں جراثیم بڑھ جاتے ہیں اگر آلو چھیل کر یا پکا کر کوئی تیزابی چیز (لیمو، سرکہ) ملائے بغیر رات بھر رکھ دیں تو اس پر کثیر الاشکال بیکٹریا (Proteus Bacteria) پیدا ہوتے ہیں۔ خصوصاً مرطوب اور گرم موسم میں یہ بات عام طور پر ہوتی ہے۔ اس سے آلو سڑ کر خراب ہو جاتا ہے اس کو کھانے سے تسمیم غذا (Food Poisoning) ہو جاتی ہے۔ آلو کو کچالو بناتے وقت ہی ابالنا چاہیے اور کچالو کو دوسرے دن کے لیے نہیں رکھنا چاہیے۔ اسی طرح چقندر بھی کاٹ کر رکھنے سے خراب ہو جاتا ہے۔ سلاد میں کچی پیاز ملا کر تو قطعی دوسرے دن کے لیے نہیں رکھنا چاہیے۔

کھانا پکانے، کھانا رکھنے اور کھانے کے برتن

بہت سی دھاتیں کھانے میں موجود چیزوں میں گھل جاتی ہیں یا کیمیاوی، ان پر عمل کرتی ہیں۔ اس سے کبھی کبھی بہت نقصان ہوتا ہے۔ تانبا، جستہ، لوہا، ٹین کے برتنوں میں یہ بات خصوصی طور پر مشاہدہ میں آئی ہے۔ وہ پھل اور سبزیاں جن میں تیزاب ہو پکانے کے بعد زیادہ دیر برتن میں نہیں رکھنا چاہیے۔ کیونکہ تیزاب میں دھات گھل کر غذا میں شامل ہو جاتی ہے اور نقصان پہنچاتی ہے۔ پھلوں کے عرق جستہ کے برتنوں میں نہیں رکھنا چاہیے۔ کیونکہ عرق میں موجود تیزاب جستہ سے مل کر اس کا نمک بنا دیتا ہے اور عرق کو بدذائقہ کر دیتا ہے۔ محلول تانبے کے نمک معدی اور امعائی نلی کو خراب کرتے اور وٹامن سی کو ضائع کرتے ہیں۔ بدقلعی تانبے کے برتنوں میں یہ نمک جلد بن جاتے ہیں۔ لوہے کی کڑاہیاں بھی تیزابی غذاؤں کے پکانے اور رکھنے کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ قلعی کے لیے استعمال سیسہ بھی تیزابی غذاؤں میں گھل جاتا ہے جو زہریلا ہوتا ہے۔ سیب وغیرہ میں موجود تیزاب سے نکل کے چمچوں پر نشان پڑ جاتے ہیں۔ جرمن سلور جو نکل جستہ اور تانبہ سے مل کر بنتا ہے تیزابی غذاؤں سے خراب ہو جاتا ہے۔ المونیم کے برتنوں کو نمک کے تیزاب یا سوڈے کے پانی سے نہیں دھونا چاہیے۔ ان برتنوں میں تیزابی چیزیں کئی روز تک رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔

کھانے کے برتنوں کے لیے سب سے عمدہ دھات بیداغ اسپات Stainless Steel ہے آج کل بے داغ اسپات کے کھانے کے برتن اوزار اور مختلف کارآمد چیزیں بہت بن رہی ہیں۔ جیسے چاقو آلو چھیلنے کا اوزار کدوکش، انڈا پھینٹنے کی مشین، قیمہ بنانے کی مشین، پھلوں سے عرق نکالنے کی مشین، لہسن، پیاز کا عرق نکالنے کی مشین، دہی متھنے کا برتن، مسالہ پیسنے کی مشین۔ بہتر ہے کہ اس میں سے جو ممکن ہو ہم لوگ اپنے گھروں میں خرید کرلائیں۔ بے داغ اسپات کے برتن بہت گراں ہیں کھانا رکھنے کے لیے تام چینی کے برتن بہت مناسب ہیں یہ نسبتاً سستے بھی ہیں لیکن اس میں پکانے سے اس کے اوپر کی تہہ ٹوٹ جاتی ہے لیکن اگر اچھے قسم کی چینی ہو تو وہ گرم ہونے سے ٹوٹتی نہیں ہے۔ اب گرمی سے متاثر نہ ہونے والا نسوز کانچ (Fire Proof Class) کھانا پکانے کے مقصد کے لیے ملنے لگا ہے یہ بہت کارآمد ہے۔ اس پر تیزاب یا کسی اور چیز کا کوئی کیمیاوی اثر نہیں ہوتا۔ یہ غیر مسامدار ہوتا ہے جس کی وجہ سے غذاؤں کی خوشبو ضائع نہیں ہوتی۔ اس کے برتن کو دھونے کے بعد اس میں رکھی کسی چیز کی بو باقی نہیں رہتی۔

پریشر کوکر (Pressure Cooker)

آج کل پریشر کوکر بہت عام ہوگئے ہیں۔ اس میں کھانا پکانے میں چند فائدے ہیں۔(1) اس میں کھانا P° 212 پر بھاپ میں پکتا ہے جس میں وقت بہت کم لگتا ہے پتیلی میں گاجر پکنے میں 40 منٹ لگتے ہیں اور پریشر کوکر میں صرف تین منٹ میں تیار ہو جاتی ہے۔(2) کھانا

پکانے میں پانی بہت کم استعمال کرنا پڑتا ہے جو کہ پھلوں اور سبزیوں کے لیے مناسب ہے۔ چونکہ پریشر کوکر بالکل بند رہتا ہے اس لیے باہر سے آکسیجن شامل ہونے نہیں پاتی جس کی وجہ سے غذا کے ضروری اور اہم اجزا اور ان کی خوشبو بہت حد تک برقرار رہتی ہے۔ تکسیدی عمل کی کمی کی وجہ سے وٹامن سی گرمی کے باوجود ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔ آکسیجن کی موجودگی میں یہ وٹامن بہت جلد ایک انزائم جو خود تازی سبزی میں ہوتا ہے کے اثر سے ضائع ہو جاتا ہے لیکن اس تکسیری عمل میں وقت لگتا ہے اور وہ P°113 پر بہت تیز ہوتا ہے۔ اونچے درجۂ حرارت پر یہ عمل نہیں ہو پاتا اور P°194 پر بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ اگر وٹامن والی غذا کو دھیرے دھیرے ابالیں تو وٹامن سی کے ضائع ہونے کے زیادہ امکانات ہیں لیکن پریشر کوکر میں بہت کم وقت کے لیے گرم ہونے کی وجہ سے اس کے ضائع ہونے کا خطرہ بہت کم ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر توجہ نہ دی جائے تو پریشر کوکر میں دیر تک غذا رکھنے سے وہ بہت زیادہ پک جاتی ہے۔ اس لیے وقت کی پابندی کا بہت خیال رکھنا چاہیے اگر ہو سکے تو خود گھڑی کا الارم لگا کر پریشر کوکر استعمال کریں تو بہتر ہے۔ P°212 درجۂ حرارت کے اوپر پروٹین اور کاربوہائیڈریٹ آپس میں ایک طرح کا کیمیاوی عمل (میلارڈ کا عمل Maillard Reaction) کرتے ہیں جس کی وجہ سے پروٹین کا اعضا میں استعمال دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لیے پریشر کوکر کو استعمال کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔

بھاپ میں پکانے کا برتن

بھاپ میں پکانے کے لیے دوہری دیوار کا خاص برتن ہوتا ہے۔ اس میں کھانا بھاپ میں دھیرے دھیرے پکتا اور گلتا ہے۔ سبزیوں کی خوشبو اور غذائیت ضائع نہیں ہوتی کیونکہ گرمی زیادہ نہیں ہو پاتی اور قیمتی اجزا پانی میں گھل کر ضائع نہیں ہوتے۔ جو عورتیں گھر کے کام میں بہت مشغول رہتی ہیں ان کے لیے اس طرح کا برتن بہت کارآمد ہے کیونکہ اس میں ہانڈی کی نگرانی نہیں کرنا پڑتی یا اپنے ہی عرق ہلکی آنچ پر پکانے کے لیے ایک خاص قسم کا قلعی کیا ہوا برتن ہوتا ہے، جس کی تلی بھاری ہوتی ہے اور ایک صحیح سائز کا ڈھکن اس پر بند ہوتا ہے۔ پہلے تھوڑا گھی یا تیل برتن میں ڈال کر گرم کرتے ہیں۔ پھر اس میں سبزی بگھار دیتے ہیں اور ڈھکن مضبوطی سے بند کر دیتے ہیں، جس سے تھوڑی دیر میں سبزی سے پانی چھوٹنے لگتا ہے اسی میں سبزی گل جاتی ہے۔ جن سبزیوں میں پانی کم ہوتا ہے ان کو بگھارنے کے بعد جب پانی چھوٹنے لگے تو اس میں تھوڑا گرم پانی یا سبزی کی یخنی ڈال دیتے ہیں اس کو پانچ منٹ تیز آنچ پر رکھتے ہیں پھر آنچ کم کر دیتے ہیں۔ 20 سے 40 منٹ سبزی میں سنسناہٹ ہوتی رہتی ہے جس سے سبزی گل جاتی ہے۔ اس میں ہر وقت برتن پر ڈھکن مضبوطی سے بند رہنا چاہیے۔ اس طرح پکانے سے ذائقہ اور خوشبو ضائع نہیں ہوتے جس کی وجہ سے وہ زیادہ محرکِ اشتہا اور مفید ہوتی ہے۔

(ہماری غذا، شکیل احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، تیسری طباعت 2010)

حسن کی نگہداشت

سرسوں کے تیل کو بتائے گئے طریقے سے استعمال کریں کیونکہ آپ کی جلد، پھٹی ایڑیوں اور بالوں کے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے

سرسوں کا تیل بے شمار فوائد کا مالک ہے اور اس کا استعمال متعدد گھریلو ٹوٹکوں میں کیا جا سکتا ہے۔ آج ہم آپ کو سرسوں کے تیل کے ایسے استعمال بتاتے ہیں جو خاص سردیوں میں آپ کے لیے کارآمد ثابت ہوں گے اور اس موسم کے کئی مسائل پر قابو پانے کے حوالے سے مددگار ثابت ہوں گے۔

جلد کے لیے بہترین

سرسوں کا تیل وٹامن ای سے بھرپور ہوتا ہے جو جلد کے لیے بہترین ہوتا ہے، اسے جلد پر لگانے سے فائن لائنز اور جھریوں میں کمی آتی ہے اور یہ سن اسکرین کی طرح کام کرتا ہے۔ تاہم بہت زیادہ تیل جسم پر لگانا نقصان دہ اور خارش کا باعث بن سکتا ہے، جبکہ آئلی اور حساس جلد والے افراد کو اس کی مالش سے گریز کرنا چاہیے۔ ناریل کے تیل اور سرسوں کے تیل کی یکساں مقدار کو ملا کر مالش کرنا جلد کی رنگت کو بھی بہتر بناتا ہے۔

ایڑیاں پھٹنے اور جلد ٹوٹ جانے والے ناخن کا مسئلہ دور کرے

ایڑیاں پھٹنے کا مسئلہ مون سون اور سردیوں میں کافی عام ہو جاتا ہے اور اس سے نجات کے لیے موم اور سرسوں کے تیل کی یکساں مقدار کو مکس کر کے گرم کریں، جس سے وہ گاڑھا ہو جائے گا۔ ایڑیوں کے متاثرہ حصے پر اس مکسچر کو لگائیں اور کاٹن کی جرابیں پہن کر سو جائیں۔ اسی طرح سرسوں کا تیل ناخن پر لگانا اس کی سطح پر جذب ہو کر انھیں غذائیت فراہم کر کے مضبوط کرتا ہے۔

بالوں کی نشوونما بہتر کرے

اگر بال گر رہے ہیں یا ان کے بڑھنے کی رفتار سست ہو گئی ہو تو سرسوں کے تیل کا استعمال اس حوالے سے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ سرسوں کے تیل میں موجود بیٹا کیروٹین بالوں کی نشوونما کی رفتار تیز کر دیتا ہے، اس کی مالش سے سر کے اندر دوران خون بہتر ہوتا ہے۔ اسی طرح سرسوں کے بیج کو پیس کر پیسٹ بنا کر سرسوں کے تیل میں ملا کر سر پر رات

بھر لگا رہنے دیں تو اس سے بالوں کے گرنے کے مسئلے کو قابو کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

عرق گلاب میں پوشیدہ ایسے 2 راز جو ان پریشانیوں کو کم کردے

عرق گلاب حسن اور صحت کا ایسا مظہر ہے جس کے اندر قدرت نے انسانوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ عرق گلاب جلدی امراض کے علاوہ جسم انسانی کے دیگر اعضاء کے لیے بھی کارآمد دوا کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے یہاں عموماً حسن و خوبصورتی کے لیے مختلف اقسام کی بازاری چیزوں پر انحصار کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے چہرہ دلکشی کے چند مناظر دکھانے کے بعد مختلف عوارض میں مبتلا ہوجاتا ہے کیونکہ حسن وزیبائش کے لیے استعمال ہونے والی یہ کاسمیٹکس اشیاء عموماً کیمیائی اجزاء سے تیار کی جاتی ہیں۔ اس لیے زیادہ تر غیر معیاری ثابت ہوتی ہیں جن کی وجہ سے انسانی چہرہ مختلف بیماریوں کا مسکن بن کر رہ جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج سے دو تین عشرے قبل ہمارے یہاں ایسی بازاری کاسمیٹکس کا کوئی رجحان نہیں تھا۔ خواتین اپنے چہرے کی دلکشی کے لیے قدرتی اشیاء اور جڑی بوٹیوں کا استعمال کرتی تھیں جس سے ان کا چہرہ صاف و شفاف اور تروتازہ رہتا تھا۔ جو خواتین حسن وزیبائش اور خصوصاً جلدی امراض سے محفوظ رہنے کے لیے عرق گلاب اور لیموں کا رس استعمال کرتی تھیں انھیں یہ جان کر اطمینان ہوگا کہ بعد میں جدید طب نے ان دونوں چیزوں کو دلکشی اور جلد کی صحت کا امین قرار دیا۔ جلد کے لیے گوہر نایاب عرق گلاب انسانی جلد کے لیے ایک گوہر نایاب ہے اور جلدی امراض کے ماہر انھیں متعدد بیماریوں میں استعمال کراتے ہیں۔ عرق گلاب جلد کی قوت مدافعت بڑھانے کے ساتھ ساتھ جلد میں پانی کی صحیح مقدار قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے جس کی وجہ سے جلد ملائم چمکدار اور ہموار رہتی ہے۔ سردیوں میں بچوں کے چہرے پر عموماً سفید اور کھردرے نشان سے بن جاتے ہیں جن کو عموماً کیلشیم کی کمی سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے یہ نشان Alpapityrias کہلاتے ہیں جو ایک جلدی بیماری ہے۔ عرق گلاب کے مسلسل استعمال سے اس مرض کا علاج ممکن ہے۔ چہرے کی جھائیاں دور کرنی ہوں یا جلد کی رنگت میں نکھار پیدا کرنا ہو تو عموماً بازاری کریمیں استعمال کی جاتی ہیں مگر ماہرین امراض جلد عرق گلاب کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ چہرے کو خشکی اور جھریوں سے بچانے اور رنگت صاف کرنے کے لیے عرق گلاب میں گلیسرین اور لیموں کا رس ملا کر استعمال کیا جائے تو مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بعض مرد و خواتین کی ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں اگر وہ عرق گلاب اور گلیسرین کا مکسچر لگائیں تو ان کی یہ بیماری ختم ہوسکتی ہے۔ عرق گلاب زیتون اور شہد کے ساتھ ملا کر پیا جائے تو یہ جلد اور معدہ کی حفاظت کے متعدد امور انجام دیتا ہے۔ خصوصاً عرق گلاب پینے سے قبض دور ہوجاتی ہے اور یہ انتڑیوں کو جراثیم سے پاک کردیتا ہے۔ آنکھوں کے امراض میں عرق گلاب کا کمال جدید طب نے عرق گلاب کو آنکھوں کا نور کہا ہے اور آج ماحولیاتی آلودگی کے اس دور میں اس کا استعمال ناگزیر قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر اس بات پر بھی متفق ہیں کہ گرد و غبار اور دھوئیں کے مضر اثرات سے بچنے کے لیے آنکھوں میں چند قطرے عرق گلاب ڈال لینے سے بھی آنکھوں کی مکمل صفائی ہوجاتی ہے جبکہ اطباء کہتے ہیں کہ عرق گلاب بطور ڈراپر سب سے مؤثر دوا ہے کیونکہ یہ آنکھوں کو صاف ستھرا رکھ کر جراثیم سے محفوظ کرتا ہے۔ آشوب چشم جیسے خوفناک مرض سے نجات حاصل کرنے کے لیے عرق گلاب کے چند قطرے مؤثر دوا ثابت ہوتے ہیں۔ عرق گلاب آنکھوں کا ایک ایسا محافظ ثابت ہوا ہے جس سے نہ صرف بصارت تیز ہوتی ہے بلکہ آنکھوں میں طلسماتی چمک بھی پیدا ہوتی ہے اور آنکھوں کا گدلا پن ہمیشہ کے لیے دور ہوجاتا ہے۔

(بحوالہ: www.hamariweb.com)

تاثرات: نگر نگر سے

جنوری کا شمارہ موصول ہوا۔اس شمارے کے تقریباً سبھی مضامین خواتین کے ذریعے لکھے گئے ہیں۔ پہلا مضمون ’’اردو نشریات کا اہم نام: سعیدہ بانو‘‘ ہے۔اس کو شخصیت کے ذیل میں دیا گیا ہے۔ مضمون کو پڑھ کر ہم پر آشکار ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ ہمارا ملک آزاد نہیں ہوا تھا اس وقت بھی خواتین نے اپنی آزادی کے لیے جدو جہد کی۔سعیدہ بانو نے اس وقت اپنی توجہ کا مرکز ومحور آل انڈیا ریڈیو کو بنایا اور اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے وہ دہلی آگئیں۔سعیدہ بانو نے گھر کے افراد کی کوئی پرواہ نہیں کی اور انھوں نے سب کی ناراضگی مول لی۔ دہلی آل انڈیا ریڈیو سے ان کو فون کیا گیا تھا کہ وہ دہلی آئیں اور آل انڈیا ریڈیو میں اپنی خدمات انجام دیں۔اس سے پہلے انھوں نے خود آل انڈیا ریڈیو دہلی کے لیے ایک درخواست دی تھی۔ان کی درخواست کو منظور کر لیا گیا تھا۔گھر، خاندان اور ان کے شوہر اس قدم کے سخت خلاف تھے۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ گھر کو چھوڑ کر باہر نوکری کرنے جائیں۔لیکن سعیدہ بانو نے اپنی راہ الگ نکالی اور کسی کی کوئی پرواہ نہیں کی۔خواتین کے لیے اس وقت یہ ایک اہم مسئلہ تھا کہ ان کا گھر سے باہر نکلنا نہ صرف معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ ان پر گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ پردے کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔سعیدہ بانو کی اس کوشش کو اہم کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس شمارے کے تمام مضامین اعلیٰ اور معیاری ہیں جن کو پڑھ کر خواتین کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔’خواتین دنیا‘ کی آرائش وزیبائش بھی کافی پرکشش اور جاذب نظر ہے۔یہ رسالہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل قرار پاتا ہے کہ اس میں خواتین سے متعلق مضامین موجود ہوتے ہیں جو علمی، ادبی اور سماجی نوعیت کے ہوتے ہیں۔اس کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی خواتین کتنی متحرک اور فعال ہیں اور زندگی کے تمام میدانوں میں کامیابی حاصل کرنے کا جذبہ رکھتی ہیں۔حسن سخن کے تحت جو غزلیں دی گئی ہیں وہ بھی قابل مطالعہ ہیں خصوصاً نعیمہ جعفری پاشا کی نظم جو کہ عورت کے تعلق سے ہے۔صحت کے تحت جو مضمون دیا گیا ہے وہ بھی ہمارے علم میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔علاوہ ازیں حسن کی نگہداشت اور باورچی خانہ کے کالم بھی لاجواب ہیں۔میری نیک خواہشات ’خواتین دنیا‘ کے لیے کہ یہ مستقبل میں بھی اسی طرح ترقی کرتا رہے۔

بشریٰ انصاری، ممبئی، مہاراشٹر

ستائس سالہ زینب بنی جج

ای۔ ٹی۔ وی بھارت ڈاٹ کام ۔ریاست اتراکھنڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سر چندی کی رہنے والی زینب اب پی سی ایس جے امتحان پاس کرنے کے بعد جج کا عہدہ سنبھالنے والی ہیں۔

دسمبر 2019 میں پی سی ایس جے کے امتحانات ہوئے تھے جس میں ایک چھوٹے متوسط گھرانے کی زینب نے پی سی ایس جے امتحان پاس کر اپنے کنبے اور گاؤں کا نام روشن کیا ہے۔

زینب نے اپنی اس کامیابی کا صلہ اپنے والدین اور بزرگوں کی دعاؤں کو بتایا ہے کیونکہ ان کے گھر والوں نے ہر مشکل گھڑی میں ان کا ساتھ دیا ہے اور انھیں یہ احساس بالکل بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی بھی راستے پر اکیلے ہیں۔

ستائس سالہ زینب نے اپنی ابتدائی تعلیم سہارنپور کے آریا کنیا انٹر کالج سے حاصل کی جس کے بعد انھوں نے جے وی جین ڈگری کالج سے ایل ایل بی کی تعلیم مکمل کی اور یہاں وہ گولڈ میڈلسٹ رہیں۔

اس کے بعد زینب نے جودھ پور کی نیشنل لاء یونیورسٹی سے ایل ایل ایم کی تعلیم بھی حاصل کی اور اب زینب جج کا عہدہ سنبھالنے جا رہی ہیں۔

ای ٹی وی بھارت سے خصوصی بات چیت کے دوران انھوں نے اپنی مشکلات سے بھرے ہوئے سفر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات کافی

معنی رکھتی ہے کہ آپ ایک چھوٹے سے گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک لڑکی ہونے کے ناطے لوگ بھی سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے والدین کو بھی کافی کڑوی باتیں سہنا پڑی، خاص طور سے امتحانات کے لیے کافی جدوجہد کرنا پڑی تھی لیکن ان کے گھر والوں نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا جس کے سبب ان کا جج بننے کا خواب حقیقت میں تبدیل ہوا۔

لڑکیوں کے نام پیغام دیتے ہوئے زینب نے کہا کہ 'اگر کسی کو

لڑکی ہونے کا تعصب جھیلنا پڑتا ہے اور اگر اس موقع پر کوئی انھیں تھوڑا بھی سہارا دے تو اس کا مطلب اسے آپ پر یقین ہے اور اسی چیز سے آپ کو اپنے اندر ہمت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

زینب کے والد زاہد حسین نے بیٹی زینب کو دعاؤں سے نوازتے ہوئے کہا کہ انسان کو کبھی بھی خدا کی ذات سے ناامید نہیں ہونا چاہیے، وہ راہ راست پر چلنے والوں کو منزل مقصود تک ضرور لے جاتا ہے۔

پدما شری ایوارڈ ایک بہت بڑا اعزاز: رانی رام پال

نئی دہلی 26 جنوری (سیاست ڈاٹ کم) ہندوستان کی خواتین ہاکی ٹیم کی کپتان رانی رام پال نے آج کہا کہ باوقار پدما شری ایوارڈ کے لیے انھیں نامزد کیا جانا ان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ حکومت نے

رانی رام پال کا نام ملک کے چوتھے اعلیٰ ترین سیویلین ایوارڈ کے لیے منتخب کیا ہے۔ رانی رام پال ان آٹھ اسپورٹس شخصیتوں میں شامل ہیں جنھیں پدما ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔ یہ نامزدگی ملک کے 71 ویں یوم جمہوریہ کے موقع پر عمل میں آئی ہے۔ رانی ان چھ ایتھلیٹس میں شامل ہیں جنھیں پدما شری سے سرفراز کیا جائے گا۔ 25 سالہ رانی نے اپنے ردعمل میں کہا کہ اس ایوارڈ کا حاصل کرنا ان کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ وہ یہ ایوارڈ اپنی ساری ٹیم اور اپنے ساتھی عملہ کے نام معنون کرتی ہیں۔ وہ اس ایوارڈ کے لیے رن رجیجو اور ہاکی انڈیا اور کوچ بلدیو سنگھ، افراد خاندان، دوست احباب اور پرستاروں کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔ رانی رامپال نے ہندوستان کے لیے 200 سے زیادہ میچس کھیلے ہیں اور حال ہی میں انھوں نے ٹیم کو ٹوکیو اولمپکس میں جگہ حاصل کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ کوالیفائنگ میچ میں ہندوستان نے امریکہ کے خلاف کامیابی حاصل کرتے ہوئے یہ مقام حاصل کیا تھا۔ بعدازاں ہاکی انڈیا کی جانب سے ایک پریس نوٹ جاری کرتے ہوئے رانی رامپال نے کہا کہ یہ ایک بڑا اعزاز ہے۔ اس کے ذریعہ ملک میں خواتین کی ہاکی کو مسلمہ حیثیت دی گئی ہے۔ ہم نے اس کھیل میں ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ ٹیم انڈیا اور بھی شاندار نتائج حاصل کرسکتی ہے۔ اپنے ٹویٹ میں کرن رجیجو نے رانی رامپال کو اس اعزاز کے لیے مبارکباد پیش کی اور کہاں کہ وہ ملک کی نوجوان نسل کے لیے جذبہ پیدا کرنے کا باعث ہیں۔ ان کی کوششوں نے ہندوستانی ہاکی کو ایک نئی سطح پر پہنچادیا ہے۔ انھیں رانی رامپال کی کامیابیوں پر فخر ہے۔ ہاکی انڈیا نے بھی رانی کو مبارکباد دی ہے۔ ہاکی انڈیا کے صدر محمد مشتاق احمد نے کہا کہ ایک مشکل پس منظر سے تعلق رکھنے کے باوجود رانی رامپال ہندوستانی خواتین کے لیے امید کی کرن بن گئی ہیں جو اپنے طور پر کامیابیاں حاصل کرنا چاہتی ہیں لیکن انھیں مشکلات کا سامنا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے رانی رامپال نے ایک مثال قائم کی ہے کہ جہد مسلسل سے کوئی بھی کامیابی حاصل کرنا دشوار نہیں رہتا۔ رانی رامپال نے 2008 میں اولمپک کوالیفائنگ مقابلوں سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔

□□□

سہ ماہی 'فکر و تحقیق' (جنوری تا مارچ 2020) کے تازہ شمارے میں
سہ ماہی فکر و تحقیق
• طیبت ادب / ندیم غوری
• شاہ غلام حسین چشتی اچھے پوری / احید ریاباتی
• مثنوی اور داستان کی مشترک تہذیب / توقیر عالم
• مرزا سلامت علی دبیر کی غزل کائنات / ابوبکر عباد
• میراجی کے تراجم / حقانی القاسمی
• مثنوی عالم — عالم آرا بیگم کی ایک نایاب مثنوی / منجر بلال بھارتی
• ہندوستانی عہد وسطی کا قانونی منظر نامہ / صالح امین
• جدید عربی ادب میں آزادی نسواں / جاں نثار معین
• اٹھارہویں صدی کا ہندوستانی
• منظر نامہ اور اردو طنز و مزاح / روشن آرا
قیمت: فی شمارہ: 25 روپے
زر سالانہ: عام ڈاک سے 100 روپے، رجسٹرڈ ڈاک سے: 200 روپے
رابطہ: شعبہ فروخت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7،
آر کے پورم، نئی دہلی — 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159
E-mail.ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

لفظ (کچھ نظمیں اور غزلیں)

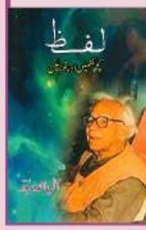

مصنف: آل احمد سرور

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 95

قیمت: 70 روپے

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

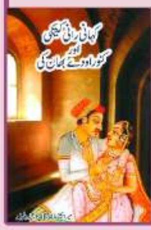

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 30

قیمت: 35 روپے

مثنوی مولانا روم (جلد اوّل، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم)

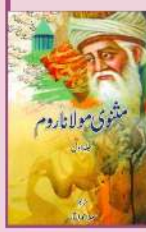

مترجم: سید احمد ایثار

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 223 (جلد اوّل)، 191 (دوم)، 251 (سوم)، 200 (چہارم) 238 (پنجم)، 256 (ششم)

قیمت: 780 روپے (فی سیٹ)

صحت الفاظ

مصنف: سید بدر الحسن

ساتویں طباعت: 2019

صفحات: 253

قیمت: 90 روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 474

قیمت: 215 روپے

قطبی علاقے کیا ہیں؟

مصنف: ہایانون

اردو مترجم: انیس الحسن صدیقی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 20

قیمت: 20 روپے

کہکشاں (اقبال کے بعد نظمیہ شاعری)

مصنف: وارث علوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 527

قیمت: 240 روپے

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly March 2020, Vol. 4, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025